مقدمہ

تفسیر نظام القرآن

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

مولانا امین احسن اصلاحی

سلسلہ دائرہ حمیدیہ نمبر ۹ جلد

مقدمہ

تفسیر نظام القرآن

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نظیر
تصنیف فاتحہ نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان کا

اردو ترجمہ

از

مولانا امین احسن اصلاحی

ناشر

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڑھ

طبع اول

تعداد اشاعت
۱۰۰۰

۳
عـ

اصولِ تفسیر اردو

مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی

مضامین مقدمہ نظام القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الذی اوتی جوامع الکلم وفصل الخطاب وعلیٰ آلہ واصحابہ الذین ھم فی الکتاب من اولی الالباب۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے میں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیاتِ قرآن کے باہمی تعلق کو واضح کردوں اور قرآن مجید کی ایک ایسی سادہ و صاف تفسیر لکھوں جو اُن تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو، جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے ہر آیت کا مفہوم اس کی مشابہ دوسری آیات کی روشنی میں متعین کیا ہے اور ہر سورت کے نظام کو اس کی تہ میں اتر کر اور اس کے سیاق کو سمجھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، پھر اس جد وجہد سے جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اس کو عقل ونقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے۔

نظم قرآن

میں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ نظم کی تلاش میں

میں نے کسی شخص کی پیروی نہیں کی ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی بصیرت میری رہنما رہی ہے۔ تاہم یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ قرآن کے اندر نظم کی تلاش میں، میں تنہا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں اور اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں :۔

"ابوحیان کے شیخ علامہ ابوجعفر بن زبیر نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس کا نام "البرھان فی مناسبتہ سور القرآن" ہے۔ ہمارے ہمعصروں میں شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" میں نظم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔"

اس کے بعد علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سورتوں اور آیتوں کی مناسبت کے علاوہ اعجاز قرآن کے مختلف پہلو بھی انھوں نے بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ "نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔ اس کے اشکال کی وجہ سے علماء نے اس سے بہت کم بحث کی ہے۔ امام فخرالدین رازیؒ تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی حکمت کا بڑا حصّہ ترتیب و نظم کے اندر چھپا ہوا ہے۔"

خود مجھے امام رازیؒ کی تفسیر کبیر میں آیت "وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا الآیۃ" (حم السجدہ ۵) کے تحت نظم قرآن سے متعلق اُن کا مندرجہ ذیل بیان ملا۔

"اس آیت کی شانِ نزول کے بارہ میں یہ روایت ہے کہ کفار نے ازراہِ شرارت

کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا تو یہ آیت اتری میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن میں ایسی آتیں بھی ہیں جن میں باہم کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چیز قرآن مجید پر ایک بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کو ایک معجزہ ثابت کرنا تو الگ رہا ہم اس کے ایک منظم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کرسکتے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لیکر آخر تک بالکل مسلسل کلام ہے۔ (اس کے بعد سورہ کے مضمون پر اجمالاً گفتگو کرکے فرماتے ہیں) ہر شخص جس میں انصاف ہوگا وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر آیت کی یہ تفسیر کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ سورہ شروع سے لیکر آخر تک ایسے منظم کلام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جس میں ایک خاص موضوع پیش نظر رکھا گیا ہو اور یقیناً یہ تفسیر اس تفسیر سے کہیں بہتر ہوگی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔"

اس کے بالمقابل ایک دوسری جماعت بھی ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں کسی قسم کا نظم نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ عزّ الدین بن عبد السّلام کہتے ہیں :-

"قرآن مجید بیس سال سے کچھ زیادہ کی طویل مدت میں، مختلف حالات کے لئے گوناگوں احکام لے کر نازل ہوا۔ جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو اس میں کسی قسم کا ربط و نظم نہیں ہو سکتا۔"

یہ علماء کے دو مختلف مذہب ہیں اور ان دونوں مذہبوں کے حامی و مؤید ہمارے ہاں

موجود ہیں۔ میرے نزدیک پہلا مذہب صحیح ہے اور میں اسی کا پیرو ہوں۔

اس تفصیل سے میں دو باتیں واضح کرنی چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بارہ میں علماء نے یک قلم سکوت اختیار کیا ہو بلکہ ایک گروہ نے اس کی طرف بہت اہتمام کے ساتھ توجہ کی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ ایک تنگ راہ ہے جس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور یہ ایک ایسا مدفون خزانہ ہے جس کا بہت قلیل حصہ اب تک دریافت ہو سکا ہے۔

مجھ پر نظم کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے، سب سے پہلے سورۂ بقرہ اور سورۂ قصص میں کھولا، اور اس کی طرف میری رہنمائی باہر سے نہیں بلکہ خود قرآن کے اندر سے ہوئی۔ میں قرآن کی تلاوت کا ہمیشہ سے دلدادہ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ میری سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ کتاب یہی رہی ہے۔ میں سنا کرتا تھا کہ قرآن مجید چونکہ مختلف اوقات و حالات میں تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا ہے، اس وجہ سے نظم کے اعتبار سے یہ سب سے زیادہ منتشر کتاب ہے، لیکن دو سورتوں میں جب مجھے نظم معلوم ہو گیا تو بقیہ سورتوں پر غور کرنے کی مجھے تحریک ہوئی۔

یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب میں ابتدائی زندگی کی تعلیمی مشغولیتوں میں منہمک تھا اور اس طرح کے کسی کام کے لئے بہت کم وقت بچا سکتا تھا، اس طرح دس سال سے کچھ زیادہ مدت بیت گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق نے میری دست گیری فرمائی اور میں نے قرآن پر ایک طرف سے' اس نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کیا۔ سال بھر کی مدت میں اس کام کو میں نے تمام کیا، اس کے بعد یہ خیال ہوا کہ اپنے فکر و تدبر کا نتیجہ لوگوں کے سامنے پیش کروں، لیکن ایک عظیم ذمہ داری اور اس کے دور رس نتائج کے ہیبتناک احساس نے مجھے ڈرا دیا۔

چنانچہ ایک طویل مدت تک میں قرآن مجید پر بار بار غور کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے برابر مانگتا رہا کہ وہ مجھے نفس کی شرارتوں سے اور جہل کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔ ہرچند کہ حقیقت ایک عرصہ سے میرے سامنے بالکل واضح تھی لیکن میری دلی خواہش یہی رہی کہ میں اس کے اظہار کی مسئولیت اور اس کے خیر و شر کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو بچا لے جاؤں۔ لیکن مندرجہ ذیل اسباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس ذمہ داری کے اٹھانے سے گریز نہ کروں۔

۱۔ سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لئے مجبور کیا یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ تاویل کا بیشتر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا عمود یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا بلکہ سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی۔

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔	ایک بارآور درخت کے مانند جس کی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں

اور سارے مسلمان اللہ کی رسی متحد ہو کر تھام لیتے جیسا کہ فرمایا ہے:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔	اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور منتشر نہ ہو۔

لیکن جب صورت حالات اس کے بالکل برعکس ہو چکی ہے، اور لوگوں نے اس حبل اللہ المتین کو

جس کی تعریف یہ ہے کہ :۔

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ الآیۃ۔ — جس کے اندر باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔

ٹکڑے ٹکڑے سمجھ رکھا ہے تو اس اختلاف سے نجات کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ حالت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کر رہا ہے اور کلام کو اس کی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے اس کو گھسیٹے پھرتا ہے۔ ایسی حالت میں نظم کلام ہی کلام کے صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہو سکتی ہے۔ اسی سے اہل بدعت و ضلالت اور اصحاب تحریف کی کجرویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے، اور خدا کا کلام ان کی غلط تاویلوں اور تحریفوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

۲۔ دوسری چیز جو اس کے لئے محرک ہوئی وہ ملحدین کا اعتراض ہے۔ انھوں نے قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا اور میں نے دیکھا کہ علماء اسلام ان کے جواب میں بجائے اس کے کہ حق کا اظہار کرتے اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کرتے، اسی قسم کی باتیں خود بولنے لگے جس قسم کی باتیں یہ ملحدین کہہ رہے تھے۔

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔ — کیا ہی بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا۔ — اور اللہ کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر گرفت کا کوئی موقع نہیں دے گا۔

ایسی حالت میں میرے لئے ممکن نہ رہا کہ میں حق کو سرنگوں اور باطل کو سربلند دیکھتا رہوں اور چپ چاپ بیٹھا رہوں۔ بالخصوص جب کہ میں پورے یقین کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ ملحدین کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں یہ امر ہر شخص کو معلوم ہے کہ نظم کلام، کلام کا ایک جزء ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کو چھوڑ دیجئے تو خود کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہو جائے گا۔ ترکیب میں ایک زائد حقیقت ہوتی ہے جو ایک چیز کے متفرق اجزاء میں الگ الگ نہیں ہوا کرتی۔ انگور اور شراب ایک ہی چیز نہیں ہے۔ اس سبب سے اگر کوئی شخص فہم نظام سے محروم رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خود کلام کی ایک بڑی حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئی اور عجب نہیں کہ وہ اہل کتاب کی اس صفت سے جا ملے جس کا حال قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ:-

فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ	پس انہوں نے ایک بڑا حصہ اس
فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ	کتاب کا فراموش کر دیا جس کے ذریعہ سے
وَالْبَغْضَاۤءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ	ان کو یاد دہانی کی گئی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ
	ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے
	لئے دشمنی اور جھگڑے کی آگ بھڑکا دی

مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ عداوت اور بغض جس کی وبا آج مسلمانوں میں پھوٹ پڑی ہے اسی بات کا نتیجہ ہو کہ ہم نے نظم قرآن کو نظر انداز کر کے خود قرآن کے ایک حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس فتنہ کا دبنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکی ہے، یہ ہے کہ

جب کلام الٰہی کے معانی کے بارے میں ہماری رائیں مختلف ہو جائیں گی تو لازماً ہماری خواہشیں اور ہمارے ارادے بھی مختلف ہو جائیں گے اور ہمارا حال وہی ہو جائے گا جو اہل کتاب کا ہوا۔ صرف یہ فرق ہو گا کہ ان کے لئے آخری بعثت اور آخری صحیفہ کے ذریعہ سے اصلاح حال کا موقع باقی رہا تھا اور ہمارے لئے آخری چارہ کار صرف یہی محفوظ قرآن ہے۔

۴- پھر خود قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو مختلف اوقات میں حالات کے تقاضے اور ضروریات کے مطابق پر تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا۔ تاکہ دلوں میں اس کے فہم و قبول کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت پیدا ہو سکے جیسا کہ فرمایا گیا:-

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً، كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ، (فرقان :- ۳۲)	اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر پورا قرآن یک دفعہ کیوں نہیں اتارا جاتا۔ ہم نے اس کو اسی طرح اتارا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تمہارے دل کو مضبوط کریں۔

پھر اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کیا اور اس کے توضیح طلب مقامات کی تشریح فرمائی جیسا کہ سورہ قیامہ میں آیا ہے:-

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا	ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا۔ پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کر۔ پھر

بَیَانَہٗ ؕ (قیامہ :- ۱۷-۱۹) ہمارے ذمہ ہے اس کی تفصیل۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی سورہ پوری ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ خود اس کی آیتوں کو جمع کر کے سورہ کو مرتب کر دیتا اور اگر کسی قسم کی تشریح کی ضرورت ہوتی تو اس کا اضافہ بھی فرما دیتا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی ہدایت کے مطابق آیتوں کو ان کی جگہوں پر رکھتے اور جب کبھی کسی سورہ کی تکمیل میں تاخیر ہوتی تو آپؐ اپنے بے پناہ شوق تبلیغ کی وجہ سے اس کے جلد پورے ہونے کی آرزو کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تاخیر کی مصلحت پر آپ کو ان لفظوں میں توجہ دلائی :۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ — اور قرآن کے معاملہ میں وحی تمام
مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ — ہونے سے پہلے جلدی نہ کرو اور دعا
وَحْیُہٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ — کرو کہ اے پروردگار! میرے علم میں
عِلْمًا ؕ (طٰہٰ :- ۱۱۴) — افزونی فرما۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ احکام کے باب میں امت کے لئے تخفیف کی بعض آسانیاں، انسانی فطرت کے ضعف کے سبب سے ہونے والی ہیں، جیسا کہ اس آیت کے بعد ہی اس ضعف انسانی کی طرف ان لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے :۔

وَلَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ — اور ہم نے آدم سے اس سے پہلے ایک
مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ — عہد لیا تو بھول گیا اور ہم نے

لَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا ۝ (طٰہٰ: ۱۱۵)　　　　اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔

چنانچہ بہت سی آیتیں بعد میں تخفیف کے لئے[1] نازل ہوئیں۔ لیکن جو آیتیں بعد میں بطور تخفیف نازل ہوئیں ان کو بالعموم باب کے سابق احکام ہی کے پہلو میں جگہ دی گئی۔ ہمارے اس خیال کی تائید و تصدیق "اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنۡكُمۡ وَعَلِمَ اَنَّ فِيۡكُمۡ ضَعۡفًا" الآیۃ سے ہوتی ہے۔ یہ آیت اپنے اصل سابق حکم کے بہت بعد نازل ہوئی لیکن اس کے باوجود اسی سابق حکم کے پہلو میں رکھی گئی۔ اسی طرح سورۂ مزمل کی آخری آیت بھی اس کی ابتدائی آیات کے بہت بعد نازل ہوئی ہے لیکن رکھی وہیں گئی جہاں اس سلسلہ کے سابق احکام موجود تھے۔ یہی حال آیت "اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ" الآیۃ کا ہے۔ اسی طرح آیت "وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا" الآیۃ اس سلسلہ کے اصل احکام کے بعد بطور تتمہ نازل ہوئی اور رکھی بھی گئی انہی احکام کے بعد لیکن اس فرق کے ساتھ کہ غایت اہتمام کی وجہ سے پہلے تتمہ کو اس پر مقدم کر دیا گیا، جیسا کہ آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس طرح کی توضیحی و تشریحی آیات کے بعد بالعموم یہ آیت آیا کرتی ہے

وَكَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ　　　　اور اسی طرح اللہ لوگوں کے لئے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت اس وعدہ کا ایفا ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے:۔

---

[1] اشارہ ہے بقرہ آیات ۲۳۸ و ۲۳۹ کی طرف جو نماز کے بیان میں ہیں۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ‏ پھر ہمارے اوپر اسکو (قرآن کو) واضح کرنا ہے

اور اس دعا کا جواب ہے جو سورہ طٰہٰ میں مذکور ہے :۔

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ‏ میرے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر

ہمارا یہ استنباط قرآن سے تھا بعینہ اسی بات کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت اترتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھا جائے اور وہ اسی جگہ رکھی جاتی۔ اسی طرح یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ جب سورۃ تمام ہو جاتی تو جبرئیل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری سورۃ از سرِ نو سنا دیتے۔ یہی وہ جمع کرنا اور پڑھنا ہے جس کا ذکر سورہ قیامہ میں ہوا ہے اور جس کی پیروی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا تھا۔

علاوہ ازیں یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ جہاں تک قرآن مجید کی آیتوں کی ترتیب کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس بارہ میں امت کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے مسلمانوں کے جسقدر فرقے ہیں سب کے پاس قرآن مجید اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔

پھر نظم قرآن کی سب سے بڑی شہادت ان لوگوں کا علم و یقین ہے جن پر حُسنِ ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہو گئے ہیں اور جنھوں نے ان حقائق کی کوئی تجلی دیکھ لی ہے جو نظم قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار و عجائب کا کیسا عظیم الشان خزانہ ہے جس کی کلید صرف نظم ہے۔ یہ چیز ان کے ذوقِ جستجو کو شہ دیتی اور ان کی طمانیت و بصیرت میں اضافہ کرتی ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو اُجاگر کریں۔ اللہ تعالیٰ

ان کی اس سعی کو بامراد کرتا ہے اور جتنا ان کے مقدر میں ہوتا ہے وہ اس میں سے پا جاتے ہیں۔ جو دروازے کھلنے جاتے ہیں ان کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہوتے ہیں اور جو دروازے نہیں کھلتے ان کو وہ اپنی قلتِ علم و نارسائی فہم پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ کتاب الٰہی ایک سمندر ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ کوئی شخص آفتاب کو اپنے احاطہ میں نہیں لے سکتا۔ اور نہ کوئی شخص قرآن کے معاملہ میں کبھی غلطی سے محفوظ ہو سکتا لیکن یہ چیز ان کے شوق و طلب کی سرگرمی کو کمزور نہیں کرتی بلکہ ان کا ذوقِ جستجو برابر مشتعل رہتا ہے۔ اور وہ اس محنت سے جتنا کچھ بھی پاتے ہیں اس کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ جس نے بھی اس علم میں سے کچھ حصہ پایا ہے اس نے اس نعمت عظمیٰ پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ امام سیوطیؒ اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں کہ:۔

"پہلے شخص جنہوں نے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا شیخ ابوبکر نیشاپوری ہیں۔ فقہ و ادب میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ ان کے لئے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے، اور بتاتے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورۃ کے فلاں سورۃ کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے؟ اور علمائے بغداد کی تنقیص کرتے کہ یہ لوگ نظم کے علم سے بالکل محروم ہیں"۔

امام سیوطیؒ نے ابن عربی کا بھی مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے:۔

"آیات قرآن کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے۔ صرف ایک عالم نے اس علم سے تعرض کیا ہے۔ اسی اصول پر اس نے پوری سورۂ بقرہ کو منظم کر دیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ہم پر یہ درواز

کھولا لیکن ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کے قدر داں نہیں پائے۔ ساری دنیا دوں ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہوئی ہے۔ پس ہم نے اس کو مہر بند ہی رکھا اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کے اس معاملہ کو اُسی کی طرف لوٹا دیا۔"

یہی حال امام رازیؒ کا ہے وہ بھی جگہ جگہ تفسیر میں اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مخدوم مہائمی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا موضوع ہی نظم ہے۔ انھوں نے اس نعمت کی عظمت کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اور اس کے مقابل میں اپنی بے مائگی اور آلودگی کا جس درجہ ان کو احساس ہے وہ ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ اس علم کو محض فضل الٰہی کی بخشش قرار دیتے ہیں اور اسی احساس کے ماتحت انھوں نے اپنی کتاب کا نام "تبصیر الرحمان وتیسیر المنان" رکھا ہے۔

جن لوگوں نے اس علم میں سے کوئی حصہ پایا ان کی نگاہوں میں اس کا یہ درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعترافات ان کی زبانوں سے اسی وقت نکلے ہوں گے جب کہ انھوں نے محسوس کر لیا ہو گا کہ قرآن مجید کی آیتیں ایک نادر اسلوب کے ساتھ مرتب ہیں جیسا کہ شیخ ولی الدین ملوی نے کہا ہے:۔

"جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتوں میں اس لئے نظم نہیں تلاش کرنا چاہئیے کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف حالات کے ماتحت نازل ہوئی ہیں، وہ غلط کہتے ہیں۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ وہ نزول کے پہلو سے تو واقعات کے لحاظ سے ہیں لیکن ترتیب کے پہلو سے بالکل مطابق حکمت ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کے اندر اس کی مہک پا رہا ہو، اس کے جلوے دیکھ رہا ہو اور اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھو رہا ہو وہ اس چیز کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ ہاں جس نے اس کا مزہ ہی نہ چکھا ہو وہ اگر اس کا انکار کر دے تو وہ کچھ قابل الزام بھی نہیں۔

جو چیز مجھے لوگوں کے سامنے لانی ہے اس کے متعلق اس طول بیان کی چنداں ضرورت نہیں تھی، لیکن میں نے یہ تمہید اس لئے ضروری سمجھی کہ نظم کی جستجو تدبر کی محتاج ہے اور اگر تمہارے دماغ میں یہ بات جاگزیں ہے کہ قرآن مجید میں نظم سرے سے ہے ہی نہیں تو اس رائے کے ساتھ اس دشوار گذار وادی میں ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہوگا۔ ہر چیز تمھیں بیگانہ معلوم ہوگی اور اس میں سر کھپانا طبیعت پر بہت بار ہوگا۔

ایک بات تم البتہ پوچھ سکتے ہو کہ اگر نظم اس قدر عظیم الشان اور کثیر المنفعت ہونے کے ساتھ حد سے زیادہ دشوار علم تھا تو آخر صحابہؓ نے اس کے متعلق کیوں سکوت اختیار فرمایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی توضیح کیوں نہیں فرمائی؟ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ آیات کا موقع و محل صحابہؓ کے سامنے بالکل واضح تھا۔ وہ تمامتر انہی کے حالات اور انہی کے پیش نظر معاملات سے متعلق تھیں۔ اگر ہم بھی اس مبارک زمانہ میں ہوتے تو ان کا نظم ہمارے لئے بھی بالکل واضح ہوتا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ سے تفسیر بہت کم منقول ہے۔ زبان ان کی تھی، اسلوب ان کے تھے اور معاملات و حالات ان کے تھے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہو۔ پھر نظم کے سمجھنے میں ہمارا اور ان کا حال یکساں کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن اس نمایاں فرق کے باوجود یہ ضرور ہے کہ کلام کے انداز بیان اور استدلال کے طریقوں کے اندر ایسے اشارات موجود ہوتے ہیں جو آگے کی طرف انگلی اٹھاتے رہتے ہیں اور اگر آدمی کند ذہن نہ ہو بلکہ کلام کے تمام اطراف میں پھیل کر آگے بڑھنے کا عادی ہو تو یہ اشارات نظم کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہم نے اپنی تفسیر کے بنیادی اصول نظم سے متعلق کہا ہے۔ اور یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں

آگے مقدمات تفسیر کے سلسلہ میں بعض مفید مطلب اشارات اور ملیں گے۔

تفسیر آیات بالآیات اب چند باتیں اپنی تفسیر کے دوسرے اصول۔ تفسیر آیات بالآیات۔ کی نسبت لکھتے ہیں۔ علامہ سیوطیؒ اتقان میں فرماتے ہیں :۔

"علماء نے کہا ہے کہ جو شخص کتاب عزیز کی تفسیر کرنا چاہے، اس کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرے۔ قرآن میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے وہی چیز دوسری جگہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ابن جوزیؒ نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کے ان مطالب سے بحث کی ہے جو ایک جگہ مجمل ہیں اور دوسری جگہ مفصل میں نے بھی مجمل کے باب میں اس کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو سنت رسول کی طرف رجوع کرے کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حکم فرمایا ہے سب قرآن سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ	ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ	قول فیصل کے ساتھ، تاکہ تم لوگوں کے
بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ	درمیان فیصلہ کرو اس چیز کے ذریعہ سے
	جو اللہ نے تم کو دکھائی۔

اس کے علاوہ اس مضمون کی اور بھی آیتیں ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے مانند ایک اور چیز بھی اس کے ساتھ"

یعنی سنت۔ لیکن اگر سنت سے تفسیر نہ ہو سکے تو صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کرے انھوں نے چونکہ تمام قرائن و حالات کا قرآن کے نزول کے وقت مشاہدہ کیا ہے نیز فہم کامل، علم صحیح اور عمل صالح سے مشرف ہیں اس لئے وہ تفسیر کے سب سے بڑے جاننے والے ہو سکتے ہیں۔"

اس سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ پسند وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو۔

بعض علماء نے اپنی کتابوں کی بنا روایات پر رکھی ہے مثلاً ابن جریر طبریؒ۔ ان کی تفسیر کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس کے مثل کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی لیکن اس میں اکثر حدیثیں ضعیف ہیں۔ مرفوع احادیث کا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہے۔ انھوں نے دراصل اہل تاویل کے اقوال تمام اختلافات کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث میں اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید کے پیش کیا کرتا ہوں۔ پہلے ایک آیت کی تاویل اس کی ہم معنی دوسری آیات سے کرتا ہوں، اس کے بعد تبعاً اس سے متعلق صحیح احادیث کا ذکر کرتا ہوں، تاکہ نہ تو ان منکرین ہی کو کسی اعتراض

لے "مثلہ معہ" کی یہ تفسیر امام شافعیؒ نے فرمائی ہے مگر ہمارے نزدیک اس سے مراد فہم و بصیرت اور وہ روشنی ہے جس سے قلب نبوت وحی کے بعد جگمگا اٹھتا تھا۔ جیسا کہ آیت میں اشارہ ہے، "وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا الآیۃ" (فراہی)

کا موقع ملے جنھوں نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور نہ وہ ملحدین ہی کوئی اعتراض اٹھا سکیں جو ہمارے سر ایسی چیزیں تھوپتے ہیں جن کی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان ایک حجت قاطع اور ایک مرکز جامع کی حیثیت سے کام دے سکے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن سے تعلق رکھتا ہے وہ سب کا سب اس کتاب میں جمع کر دوں۔ اول تو قرآن مجید ایک ایسا خزانہ ہے جو طالبوں کی کثرت کے باوجود کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ثانیاً تفسیر کی کتابوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔ جو شخص ان کو بہ نگاہ تحقیق دیکھے گا وہ اس علم میں سے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے مطابق حصّہ پائے گا۔ میرے پیش نظر تو ایک ایسی کتاب کی تالیف ہے جو بنیاد اور مرکز کا کام دے اور جو نقطۂ اعتدال اور قول فیصل کی حیثیت سے نمودار ہو۔ اس لئے میں نے صرف تنے ہی پر اکتفا کیا ہے جتنا قرآن میں ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ میں نے چھوڑ دیا ہے اس کا منکر ہوں۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں صرف وہ روایتیں جمع کی ہیں جو اُن کے اصول پر پوری اتری ہیں اور بہت سی صحیح روایتیں چھوڑ دی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ان کے منکر ہیں۔ بلکہ میں تو اپنی اس کتاب میں ان حقائق و معارف کا عُشر عشیر بھی نہیں بیان کر سکا ہوں جو خود قرآن کے اندر مستور ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں ان کے لئے ایک علٰحدہ کتاب لکھوں گا اور اس میں حتی الامکان ان تمام معارف کو سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔

قرآن کو اصل قرار دے کر جس طرح میں روایات کو ضمناً ذکر کرتا ہوں اسی طرح ان

کتابوں کی شہادتیں بھی ضمناً پیش کرتا ہوں جو قرآن سے پیشتر نازل ہوئی ہیں اور اس سے مقصود قرآن کے ساتھ ان کی موافقت کو دکھانا اور یہود و نصاریٰ پر خود ان کی کتابوں سے حجت پیش کرنا ہے۔

دیباچۂ کتاب میں اتنی تفصیل کافی ہے، لیکن بعض دوسری باتیں ہیں جن کے ذکر کی ضرورت باقی ہے تو ان کے لئے ان مقدمات میں جگہ نکالی ہے جو تفسیر کے شروع میں لکھ دئے ہیں تاکہ اثنائے تفسیر میں جہاں ضرورت پیش آئے، ان کا حوالہ دیدیا جائے، ان کی بار بار کی تکرار سے سلسلۂ کلام میں کوئی خلل نہ پیدا ہو۔

یہ پوری کتاب ۱۱۴ اقساط میں ہے ہر سورہ کے لئے ایک قسط مخصوص ہے۔

یہ جو کچھ بھی لکھ سکا ہوں سب اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے اور تمام فضل و احسان کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ اگر میں نے کوئی صحیح بات کہی ہے تو یہ اس کا لطف و کرم ہے ورنہ فکان کما کانت حاجۃ فی نفس یعقوب قضاھا۔

مقدمہ (۱)

شانِ نزول

شانِ نزول کا مطلب، جیساکہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت و کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسرِ موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مدنظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو، اور وہ امر یا امور جن کو کسی سورہ میں مدنظر رکھا جاتا ہے، اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم کو شانِ نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کرسکتا ہے جس کے لئے نسخہ لکھا گیا ہے۔ اسی طرح تم ہر سورہ سے اس سورہ کی شانِ نزول معلوم کرسکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی خاص موضوع پیشِ نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہوگی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ کلام کے تمام اجزا باہم دگر مربوط و متصل ہوں گے۔ اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں

فلاں آیتیں فلاں فلاں معاملات کے بارہ میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورۃ کے نزول کے وقت یہ یہ احوال و مسائل درپیش تھے تاکہ معلوم ہو سکے کہ سورہ کے نزول کے لئے کیا محرکات اور اسباب موجود تھے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:۔

"زرکشی نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا۔"

زرکشی کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورہ انعام میں وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا الآیہ کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے وہاں امام رازیؒ فرماتے ہیں:۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے، وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے۔"

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہوا، صورت معاملہ یہ ہے کہ

جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے وہ اس غرض کے لئے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح و تشریح ہیں ان کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملہ کا ذکر اگرچہ نظرانداز کر دیتا ہے لیکن اس کا کلام اُس طرح کے تمام احوال و معاملات پر حاوی ہوتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملہ یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے لیکن کلام ایک عالمگیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے، جیسا کہ قرآن مجید سے خود مترشح ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ	اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت
يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ	میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل
(مائدہ: ۱۰۱)	ہو رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عین اپنے وقت نزول میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دیدیتا تھا۔ اس طرح جب ایک سورہ اپنی حد کو پہنچ جاتی اور کلام کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے تو وہ سورہ تمام کر دی جاتی اور ناممکن تھا کہ وہ اپنے حدود اقتضا سے ذرا بھی کم و بیش ہو۔

لیکن بسا اوقات ضرورت باقی رہ جاتی تھی تو اس وقت دوسری سورہ نازل کی جاتی۔ شان نزول وہی ہوتی لیکن اسلوب میں تبدیلی کر دی جاتی تاکہ یکسانی و یکرنگی

سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے بعثت کی بہت سی سورتوں میں حشر نشر توحید، تصدیق رسول اور اس سے ملتے جلتے ہوئے مضامین ملتے ہیں، صرف اسلوب اور طرز بیان کا فرق ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت کسی امر کی توضیح و تشریح کی داعی ہوتی، اس وقت کوئی آیت اترتی اور جہاں ضرورت ہوتی وہ آیت وہیں رکھ دی جاتی۔ یہ اس وعدہ کی تکمیل ہوتی جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے:۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ — پھر ہمارے ذمہ ہے اسکی توضیح کرنا۔

ایسے مواقع پر زمانہ نزول کا لحاظ نہ ہوتا بلکہ نظم کلام کا لحاظ کیا جاتا اور بالعموم اس قسم کی آیات کے بعد یہ تنبیہ بھی کر دی جاتی کہ یہ آیت بطور تشریح نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ جو آیتیں اصل احکام کے ساتھ بطور تفسیر ملائی گئی ہیں ان کے بعد بالعموم، جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں ذکر کیا ہے، یہ آیت آئی ہے:۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۔ (بقرہ) — اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو لوگوں کو سمجھانے کے لئے کھولتا ہے تاکہ وہ تقویٰ

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی تلاش میں سررشتۂ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا ورنہ تمہاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہو جائے گی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیئے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہیئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کر دیں۔ پھر سب سے زیادہ

لائق اہتمام وہ شانِ نزول ہے جو خود نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہو۔ اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ جب کوئی حکم عام کسی خاص حالت وصورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت وصورت اس حکم کی حکمت وعلت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں تعددِ ازداج اور وحدتِ ازداج دونوں کا حکم ہے۔ اب اگر تم اس شانِ نزول کو سامنے رکھو جو نظم کلام سے نکلتی ہے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ پہلا حکم یتامیٰ کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے[۱] اور دوسرا حکم بیویوں کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور ان دونوں کے درمیان، جامع رشتہ قسط بالضعفار یعنی کمزوروں کے ساتھ انصاف ہے، اور ان میں سے ترجیح اس حق کو ہوگی جو مقدم ہے یہی حال رہن کے معاملہ کا ہے۔ کسی مسلمان کا مال گرو رکھنا ایک نہایت دنائت کی بات ہے پس ضرورت کے لئے اس کی اجازت دی اور ضرورت رفع ہو جانے کے بعد اس کے لوٹا دینے کا حکم دیا۔ اس اجمالی اشارہ کی تفصیل بقرہ کی آیت ۲۸۳ کے تحت ملے گی۔

مقدمہ (۲)

تفسیر کے خبری ماخذ

بعض ماخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں، اور بعض فرع کی۔ اصل واساس

[۱] بعض مرتبہ یتیموں کی پرورش یا اس قسم کی کوئی دوسری معاشرتی یا اخلاقی واجتماعی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھے (مترجم)

کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں۔

۱۔ احادیث۔

۲۔ قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات۔

۳۔ گذشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔

اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن و شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے۔ بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ میں سے ان روایات کو نہ لے جو اصل کو ڈھانے والی ہوں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تاویل نہ کی جائے تو ان کی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے اور ان سے سلسلۂ نظم درہم برہم ہوتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل تو کر ڈالتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس کے نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ جب اصل و فرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل۔

وکاین رأینا من فروع طویلة ۔۔۔ تموت اذا لم تحیھن اصول

(اور کتنی دراز شاخیں ہم نے دیکھی ہیں کہ جب جڑیں ان کو غذا نہیں پہونچاتیں تو وہ سوکھ کے رہ جاتی ہیں۔)

اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلافِ وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت۔ اس طرح کی روایات کے بارہ میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہیے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں۔ مثلاً جو آثار حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں۔ پس اس طرح کی روایات کی طرف ہم ضمناً اشارہ کریں گے۔

اسی طرح اہل کتاب کی جو روایات ہمارے ہاں پھیلی ہوئی ہیں ان کے مقابل میں خود اہل کتاب کی تاریخ قابل ترجیح ہے کیونکہ مفسرین نے بالعموم یہ روایتیں ایسے لوگوں سے نقل کی ہیں جو بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ پس بہتر یہ ہے کہ ان کے بے اصل افسانوں کے بجائے ان کی معتبر کتابوں کو ہم ماخذ بنائیں اور ان کو تائید کے طور پر پیش کریں۔ اور جہاں کہیں وہ قرآن سے مختلف ہوں وہاں ان کو چھوڑ دیں کیونکہ یہ قطعی معلوم ہے کہ ان کتابوں میں حق کو چھپایا گیا ہے۔ نیز ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ" (تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ) اس طرح کے کتمان و تحریف کی نہایت واضح مثال حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے معاملہ

. . . .

. . . .

میں موجود ہے۔ پس لازماً جو کچھ قرآن میں ہے ہم اسی کو اصل قرار دیں گے۔ اس اصول میں کسی کے لئے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم مسلمان آسمانی کتابوں میں کسی قسم کی تفریق کو جائز نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک قرآن انہی میں سے ایک ہے۔ لیکن جب روایت میں اختلاف ہوگا تو ہم کو صحت روایت کے لئے اہتمام کرنا پڑے گا اور اس وقت ہم مجبوراً اسی روایت کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ثابت ہو۔ ہاں اگر باہم دگر کوئی اختلاف نہ ہو تو ہم درایت کی کسوٹی پر جانچ کر دوسری آسمانی کتابوں سے بھی لے سکتے ہیں اگرچہ از روئے روایت ان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ مثلاً ہم زبور میں سے اس چیز کو لیں گے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن	ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا
بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ	ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیکوکار
يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ	بندے ہوں گے۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں سے اس چیز کو اخذ کریں گے جس کی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ	یہ اگلے صحیفوں میں ہے،
الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ	ابراہیم و موسیٰ کے
وَمُوسَىٰ۔	صحیفوں میں۔

اسی طرح مندرجہ ذیل قسم کی آیات کی توضیح کے لئے ہمیں بنی اسرائیل کی

تاریخ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو
فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ	اپنے فیصلہ کی اطلاع دیدی تھی کہ
فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ۔	تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کروگے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن مجید اپنی تفسیر کے لئے ان فروع کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام کتابوں کے لئے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقع ہو تو اسی کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی بنے گی۔ لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع کی مراجعت سے تمہارے ایمان واطمینان میں اضافہ ہوگا یہی حکمت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ حکم دیا ہے:۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ	کہدو ملک میں سیاحت
ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ	کرو پھر دیکھو منکروں کا
عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝	انجام کیسا ہوا۔

بہر حال جو لوگ اگلے صحیفوں کی مراجعت کریں گے ان کو گونا گوں فوائد حاصل ہوں گے۔ مثلاً:۔

ان صحیفوں کے مقابل میں قرآنی تعلیم کی فضیلت واضح ہوگی۔

اپنی کتابوں میں سے جو کچھ اہل کتاب نے بھلا دیا ہے قرآن کی رہنمائی سے ان کا اعادہ ہوگا

جو کچھ اہل کتاب نے بدل ڈالا ہے اس کا انکشاف ہوگا۔

ایک اور قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیئے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے، اور فروع میں وہم و ظن کے لئے بہت کچھ گنجائش ہے پس اگر کوئی شخص فروع میں سے کسی بات کا منکر ہو تو وہ قرآن کے منکر کی طرح نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو نہیں منسوخ کر سکتی۔ اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے۔ لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں گے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لئے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواترہ ہو۔ پس جب یہ ائمہ حدیث، جو حدیث کے معاملہ میں صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس بارہ میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس فتنہ سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسولؐ اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس طرح کے مواقع میں تمامتر راویوں کے وہم اور ان کی غلطی کو دخل ہے۔ اور فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق کیا ہے۔ یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس لئے ہم اسی پر بس کرتے ہیں۔

مقدمہ (۳)

تفسیر کے لسانی ماخذ

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ متن قرآن کی حفاظت کریگا:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۔
ہم نے ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اسی طرح اس کی تشریح و بیان کا بھی وعدہ فرمایا ہے:-

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔
پھر ہمارے ذمہ ہے اسکی وضاحت کرنا

چنانچہ اس وعدہ کے ایفاء کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کو ایک زندہ و قائم زبان بنادیا، اور اس کو مٹنے سے محفوظ رکھا۔ اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان کے ساتھ جو اعمال متعلق ہیں، تواتر و توارث کے ساتھ، سلف سے لیکر خلف تک سب محفوظ رہے۔ ان میں جو معمولی جزوی اختلافات نظر آتے ہیں وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں۔ تیر کے معنی ہر شخص کو معلوم ہیں، تا اگرچہ مختلف ممالک کے تیروں کی شکلوں اور صورتوں

میں کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں۔ اسی طرح جو نماز دین میں مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں، ہر چند کہ اس کی ہیئت میں بعض جزئی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کرید اور موشگافی سے کام لیتے ہیں وہ اس دین فطرت کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔ یہ قرآن پاک ہی کی تعلیم ہے کہ:۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا	خدا تک تمھاری قربانیوں کے گوشت
وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰکِنْ	اور خون نہیں پہنچ سکتے بلکہ تمھارا تقویٰ
یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ۔	ہی اس تک پہونچ سکتا ہے۔

پس جو لوگ اس طرح کے امور میں زیادہ کرید کرتے ہیں وہ ان یہودیوں کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں جنھوں نے اپنے دین میں اختلاف ڈالا اور شبہات میں پڑے۔ ان لوگوں کی حالت کی تصویر قرآن نے اس جگہ کھینچی ہے جہاں سورہ بقرہ میں ان کے گائے ذبح کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ پیغمبر بار بار کہہ رہا ہے کہ:۔

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ۔	جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی تعمیل کرو

لیکن وہ برابر سوال پر سوال کئے جا رہے ہیں، اور ردوکد کے بعد بھی شاید ان کو ذبح کی توفیق نہ ہوتی لیکن "اِنْ شَاءَ اللّٰهُ" کی برکت نے ان کو ایک عظیم فتنہ سے بچا لیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کے حق میں یہ الفاظ فرمائے:۔

مَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ۔	اور قریب تھا کہ وہ نہ کرتے۔

پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری تعریف اور تصویر قرآن

میں بیان نہ ہوئی ہو تو ان کے بارہ میں خواہ مخواہ کو اخبار آحاد پر نہیں جم جانا چاہیئے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی شک میں پڑو گے اور دوسروں کے اعمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور ان سے جھگڑو گے اور تمھارے درمیان کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔ ایسی صورتوں میں صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارہ میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جھگڑا نہ کرو۔ جہاں تک اصطلاحات شرعیہ کا تعلق ہے، قرآن کی اسی وسیع شاہراہ پر چلنا چاہیئے۔

باقی رہے دوسرے الفاظ اور حقیقت و مجاز کے مختلف اسلوب تو اس باب میں ماخذ قدیم کلام عرب اور خود قرآن مجید ہے۔ لغت کی کتابیں ان چیزوں کی تحقیق میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں۔ ان سے بالعموم نہ تو الفاظ کی پوری حقیقت معلوم ہوتی نہ عربی خالص اور عربی مولد کے درمیان کوئی امتیاز ہوتا ہے اور نہ لفظ کی جڑ ہی کا پتہ لگتا کہ معلوم ہو سکے کہ کیا اصل ہے کیا فرع، اور کیا حقیقت ہے کیا مجاز؟ تو جو لوگ کلام عرب میں مہارت نہیں بہم پہنچاتے بلکہ صرف لغت کی کتابوں پر قانع ہو جاتے ہیں وہ لبا اوقات قرآن مجید کے معانی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ پھر قدیم کلام عرب کا جتنا حصہ ہم تک پہنچا ہے اس میں بہت کچھ ملاوٹ بھی ہے اور غریب و نامانوس الفاظ کی بھی اس میں آمیزش ہے لیکن ایک ناقد ماہر کے لئے اصل و نقل میں امتیاز کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ بس ضروری ہے کہ صرف وہ معنی لئے جائیں جو اصلی کلام عرب سے ماخوذ ہوں، شاذ معنی ہرگز

نہ لئے جائیں۔ مثلاً بعض لوگوں نے آیت وَمَا مِنْ نَبِيٍّ وَلَا رَسُولٍ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ الآیہ میں تمنی کے معنی تلاوت کرنے کے لئے۔ اس طرح کے غیر ثابت اور شاذ معنی کی طرف جو لوگ گئے ہیں محض بعض اشکالات سے بچنے کے لئے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اور اس سے امت میں اختلاف کا دروازہ کھلتا ہے جو شخص اصلی راہ کو چھوڑ کر چلے گا اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھائے۔

اس کے علاوہ جو دوسرے علوم زبان ہیں مثلاً نحو، منطق، اصول، بیان، بلاغت، قافیہ تو ان پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اپنے فوائد کی کثرت کے باوجود فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے لغت کی کتابوں سے بھی زیادہ کوتاہ ہیں۔ موجودہ فن نحو بہت اضافہ کا محتاج ہے۔ یہ صرف متوسط درجہ کے کلام کے لئے اصول فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے مفسر کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ کلام الٰہی کو موجودہ اصولِ نحو پر بہت زیادہ منطبق کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح کی کوشش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کو کلام الٰہی میں ایسی ترمیم و تاویل کرنی پڑے گی جس سے ایک دیکھنے والے کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن مجید زبان کی عام شاہراہ سے بالکل ہٹا ہوا ہے بلکہ اس کو کلام عرب سے وہ شہادتیں فراہم کرنی چاہیئیں جن سے یہ ثابت ہو کہ قرآن ہی کا اسلوب زبان کا اصلی اور اعلیٰ اسلوب ہے

منطق میں تمام تر مدار تحدید، نفی اور استثنار وغیرہ کے الفاظ کے استعمال میں موشگافی ہے۔ اس لئے:-

عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا	اللہ نے آدم کو سارے نام سکھائے

اور

وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُرْسِلَ	اور ہم کو نشانیوں کے بھیجنے سے نہیں
بِالْاٰیَاتِ اِلَّا اَنْ کَذَّبَ	روکا مگر اس بات نے کہ اگلوں
بِہَا الْاَوَّلُوْنَ ۔	نے ان کو جھٹلا دیا ۔

وغیرہ اسالیب میں جو دلیلیں نہاں ہیں وہ اس کی گرفت سے باہر ہیں ۔ ہم اس کے متعلق ایک دوسرے مقدمہ میں مفصل گفتگو کریں گے ۔

علم البیان کا حال بالکل نحو کا سا ہے ۔ جو کلام ایک زندہ قلب کے اندر سے ابلتا ہے یہ علم اس کی خوبیوں کو بھی واضح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو آسمانِ وحی سے برسنے والا کلام اس کی تنگنائے میں کیا سما سکے گا؟ صاحب وحی بلکہ ہر داعیٔ حق کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب حالات تقاضا کرتے ہیں اس کے قلب کے اندر سے ایک چشمہ ابلتا ہے ۔ وہ کبھی مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے، کبھی حقیقت کے بھیس میں، لیکن ہر صورت میں وہ اپنی مخاطب جماعت کی فہم اور اپنی زبان کے طریقوں کی رعایت کرتا ہے ۔ وہ باپ اور بیٹے کے الفاظ استعمال کرتا ہے ۔ اپنے جسم کو مختلف حصوں میں بانٹتا ہے، اپنا گوشت و خون دوسروں کو کھلاتا ہے، ید، ساق، وجہ، عرش، کرسی وغیرہ کلمات اپنی گفتگو میں لاتا ہے، لسط و قبض، طی و نشر، حسرت و انتقام اور غضب و محبت وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے ۔ اور اس کے مخاطب ان کو بے تکلف سمجھتے ہیں ۔ البتہ جو شخص علم بیان کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لے گا وہ چیونٹی کی طرح چلے گا اور

اندھوں کے مانند ٹھوکریں کھائے گا۔ زبور اور صحفِ انبیاء کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی کلام میں مجاز کو کس قدر دخل ہوا کرتا ہے۔

فنِ اصولِ فقہ کے متعلق ہم ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جنھوں نے اس کی بنا ڈالی۔ بے شبہہ یہ فن ایک ایسا فن ہے جس کو انھوں نے یونانیوں، ہندوستانیوں یا کسی اور قوم سے نہیں لیا ہے بلکہ ضرورت داعی ہوئی کہ یہ ایسے اصول بنائیں جو کتاب و سنت سے احکام کے استنباط کے لئے ضابطہ کا کام دیں۔ پس اس فن کے بلاشبہہ یہ لوگ بانی اور اس میں دوسروں کے یہ امام ہیں لیکن اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ بعد والوں کو اس کی تدوین و ترتیب کی توفیق نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پورا نظام کمزور اور بھس بھسا رہ گیا اور وہ ربط و نظم اس میں نہیں پیدا ہو سکا کہ اس کو فن کا نام دیا جاسکے یہی وجہ ہے کہ اس میں اختلافات بہت ہیں جو بالآخر احکام و قوانین کے اختلاف کا سبب ہوئے۔ نحو اور منطق وغیرہ کا یہ حال نہیں ہے۔ یہاں شدید ضرورت سے ہم نے اس فن سے متعلق یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ اس سے زیادہ کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس فن کو مرتب کرنے کی توفیق بخشے۔[1]

فنِ بلاغت کو لوگوں نے صرف اشعار سے مستنبط کیا ہے اور اشعار کا دائرہ معلوم ہے کہ وہ صرف در و بست کی خوبیوں، الفاظ کی نزاکتوں اور بدیع کی صنعت کاریوں تک

---

[1] مصنف مرحوم اپنی یہ تمنا پوری نہ کرسکے اس فن سے متعلق ان کے مسودات میں صرف چند اصولی بحثیں ملتی ہیں جو اگرچہ بعض نہایت اہم گتھیوں کو سلجھاتی ہیں لیکن وہ اس کمی کو پورا نہیں کرتیں جس کی طرف مصنف مرحوم نے یہاں اشارہ کیا ہے۔

محدود ہے۔ باقی رہے حسن استدلال کے گوناگوں پہلو، ربط معانی کے مختلف انداز، ضرب امثال کے مختلف طریقے، قصص سے عبرت پذیری کے مختلف ڈھنگ، کلام کا بڑھ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹنا، زجر اور عتاب، متکلم کی شدتِ یقین کا اظہار، مترفعانہ اعراض، ناصحانہ اظہار حسرت وغیرہ جن کی مثالیں صرف خطباء کے کلام اور انبیاء علیہم السلام کی وحی میں مل سکتی ہیں، ہمارے فن بلاغت نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ خطبائے عرب کا کلام ان لوگوں کو زیادہ ملا نہیں اور خطبائے عجم کے کلام پر انھوں نے غور نہیں کیا۔ چنانچہ باقلانیؒ نے باوجودیکہ بلاغت قرآن کو بے نقاب کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالا ہے لیکن استناد کے لئے تمامتر صرف اشعار پر اعتماد کیا ہے۔ خطبات کے صرف تھوڑے سے نمونے دیئے ہیں تاکہ مقابلہ کر کے تم خود کچھ فرق معلوم کر لو۔ باقی رہے وہ دس امور جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، جن میں سے پانچ عقلی ہیں اور پانچ نفسی، تو ان کا کوئی ذکر باقلانیؒ نے نہیں کیا ہے۔ یہ امور ایسے نہیں ہیں جو کسی ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہوں بلکہ تمام زبانوں میں عام ہیں اس لئے کلام سے ان پر شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ قرآن مجید خود ان کے اوپر دلیل ہے۔

پھر موجودہ علم بلاغت اسالیب کلام کی معرفت کے لئے بھی کوئی قیمتی رہنمائی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس فن کے مصنفین عموماً عجمی ہیں اور اہل عجم کے لئے عرب کے انداز و اسالیب پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ پس بجائے اس کے کہ ان کی کوتاہیوں اور نارسائیوں کی شکایت کی جائے، جو تھوڑی بہت خدمت انھوں نے اس فن کی کی ہے اس پر ہم

ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ یہ کیا کم ہے کہ بعض جگہ ان کا تیر نشانہ پر لگا ہے اور بعض جگہ اگر نشانہ پر نہیں لگا ہے تو اس کے قریب قریب پہنچا ہے۔ اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے میں ایک علٰحدہ مقدمہ میں بعض ایسے اسالیب کا ذکر کروں گا جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح قوانی قرآن اور اس کے کلمات کے نظم کے متعلق بھی علٰحدہ گفتگو کروں گا[۱]۔

مقدمہ (۴)

آسمانی کتابوں کی شرح ایک دوسرے کی مدد سے

یہاں میرا مقصد صرف اس شرح و توضیح سے ہے جس کا تعلق زبان اور اسالیب بیان سے ہے ما باقی رہے احکام و قوانین اور واقعات و قصص تو ان کے متعلق ایک دوسرے مقدمہ میں گفتگو کروں گا۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام جس کی روایت یونانی زبان میں ہوئی، در اصل عبرانی زبان میں تھا۔ انجیل اور توریت کی زبان ایک ہی ہے۔ اور یہ امر بھی ہر شخص کو معلوم ہے کہ عربی اور عبرانی، جو آسمانی کتابوں کی زبانیں ہیں، دونوں ایک ہی اصل سے نکلی ہیں۔ ایسی صورت میں ناگزیر ہے کہ ان دونوں میں گہری مماثلت و مشابہت ہو اور ان میں سے

---

[۱] ان مسائل پر تفصیلی بحث اس مقدمہ کے بجائے مولانا نے اپنی کتاب جمہرۃ البلاغۃ میں کی ہے اسکو دیکھنا چاہیئے (مترجم)

ہر ایک دوسرے کے معانی کی طرف رہبری کرے۔ پھر ان تمام صحیفوں کے مطالب بھی ایک سے ہیں۔ یہ سب وحی کے پاک چشمہ سے نکلے ہیں۔ اس لئے بھی ان میں یکسانی وہمرنگی ہونا قدرتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ جو امور اہلِ کتاب پر مشتبہ رہ گئے، قرآن ہمارے لئے ان کی تفصیل کریگا۔ پس ان امور کا جاننا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ نیز قرآن مجید پچھلی سمانی کتابوں کا مُصدق ہے تو اُن کی باہمی موافقت اور سازگاری لازماً ایمان کی زیادتی اور اطمینانِ قلب کا باعث ہوگی۔ پھر قرآن مجید جھگڑے کو چکانیوالی اور اختلافات کو رفع کرنیوالی کتاب بنکر نازل ہوا ہے اور اس کے ماسوا اکثر کتب منزلہ تخئیل اور شعر ہیں لہذا جو لوگ ان کتابوں کو سمجھنا چاہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ اُن کو قرآن کی روشنی میں سمجھیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ پرانے صحیفے متروک ہو چکے ہیں اس وجہ سے اُن کی زبان مٹ چکی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان کو سمجھنا چاہے تو اس کے لئے صرف ایک ہی شکل ہے کہ وہ قرآن کی زبان سے رہنمائی حاصل کرے۔

ان باتوں کی طرف میرا ذہن اس لئے گیا کہ میں جانتا ہوں کہ انجیل اور توریت کی بہت سی باتیں، ان کے ماننے والوں کے لئے فتنہ بن گئی ہیں۔ حالانکہ اگر وہ عربی زبان جانتے ہوتے تو اس گمراہی میں نہ پڑتے۔ حضرت مسیح علیہ السّلام نے فرمایا ہے کہ "آدمی لفظوں سے ہلاک ہوتا ہے اور معانی سے نجات پاتا ہے۔" یہ لوگ الفاظ پر جم گئے اس لئے ان پر ہدایت کی راہ نہ کھل سکی۔ اسی سے ملتا جلتا حال مسلمانوں کا ہے۔ بعض مسلمان انجیل کی بعض عبارتوں کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ اگر وہ قرآن کی تعلیم سے ان کو مطابقت دے سکیں تو اُن کو معلوم ہو کہ ان باتوں

کے ماننے کی سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں ہی پر ہے۔ قرآن میں ہم کو متشابہات پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ آخر یہ حکم دوسری آسمانی کتابوں کے متعلق بھی کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید میں صاف وارد ہے کہ اگر ایک شخص ایک بات کی تاویل نہ جاننے کی وجہ سے اس کا انکار کردے تو وہ سخت گنہگار ہے:۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا	بلکہ انھوں نے اس چیز کا انکار کیا
بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ	جو ان کے علم کے دائرہ میں نہ سما سکی اور
كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ	جس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی
مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ	نمودار نہیں ہوئی۔ ایسے ہی ان لوگوں نے
كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۔	انکار کیا جو ان سے پہلے تھے تو دیکھو ظالموں

کا انجام کیا ہوا۔

اسی کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ آپ نے فرمایا لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ اہل کتاب کی تصدیق نہ کرو (یعنی جو کچھ کتب مقدسہ سے روایت کریں اس کی تصدیق نہ کرو کیونکہ انھوں نے اس کو محفوظ نہیں رکھا) وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ اور نہ ان کی تکذیب کرو (کیونکہ ممکن ہے وہ ان باتوں میں سے ہو جس کی حقیقت ابھی ہمارے سامنے نہیں آئی ہو)

اگر تم کو شبہہ ہو کہ یہ کتب مقدسہ غیر محفوظ ہیں اس وجہ سے اگر قرآن کی تاویل میں ہم ان سے رجوع کریں گے تو غلطی میں پڑنے کا امکان ہے، تو یہ شبہہ بالکل بجا ہے۔ لیکن ہم یہ بات نہیں کہتے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ پہلے قرآن کو خود قرآن اور عربی زبان کی مدد سے

سمجھنا چاہیئے پھر اگر کتب مقدسہ میں کوئی ایسی بات ملے جو معنی اور اسلوب کے اعتبار سے قرآن سے ملتی جلتی یا اس سے واضح تعلق رکھتی ہوئی نظر آئے تو دونوں باتوں پہ تدبر اور ان دونو اسلوبوں کے تقابل سے قرآن مجید کی بلاغت واضح ہوگی نیز مختلف معانی میں سے ہم جس مفہوم کو ترجیح دیں گے اس تائید مزید سے اس پہ ہمارا اعتماد مضبوط ہوگا۔ علاوہ بریں وحی قدیم کی بعض ایسی باتوں کا مفہوم ہم پہ واضح ہو جائے گا جس کا واضح ہونا بظاہر محال نظر آتا تھا۔ یہ چیز اہل کتاب کے ارباب نظر کے لئے قرآن کی صداقت کی اور ہمارے لئے خود ان کی کتابوں کی صداقت کی ایک دلیل ہوگی جس سے باہمی محبت کی راہیں بھی کھلیں گی اور یہ چیز ان کی ہدایت کے لئے بھی راہ ہموار کرے گی۔

لیکن اس کے برعکس، تم دیکھتے ہو کہ بعض مسلمان انجیل کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو لوگ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا مذاق اڑائیں ان کی شکایت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کس سے کی جاسکتی ہے؟ مسلمانوں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ان کو صرف خوبصورت انداز سے مباحثہ کی اجازت دی گئی ہے اور مخالف فریق کو برا بھلا کہنے سے نہایت سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اس چیز کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ ہم سے ان کی دوری بڑھتی گئی اور یہ خلیج اختلاف وسیع تر ہوتی چلی گئی اور پھر لازمی نتیجہ کے طور پر قبول حق سے بھی وہ محروم رہے۔ حالانکہ اگر یہ سچ ہے کہ حق باطل پر غالب رہتا ہے اور روشنی تاریکی کو مٹا دیتی ہے تو ہمارے اور ان کے درمیان اس سے بڑھ کر کوئی حجت نہیں ہوسکتی کہ ہم دونوں چیزوں کو ایک ساتھ برابر برابر رکھ دیں کہ جس کے اندر عقل اور مذاقِ سلیم

موجود ہے وہ ان میں سے بہتر کو خود منتخب کرلے۔ قرآن مجید نے ہدایت پانے والوں کی تعریف یہی کی ہے:۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ	جو لوگ بات سنتے ہیں اور پھر اس میں جو
فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ	بہتر ہوتی ہو اس کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ وجوہ داعی ہوئے کہ عہد جدید اور عہد عتیق میں جو کچھ ہے میں اس کی بھی جستجو کروں۔ میری نیت نیک ہے اور میرا اعتماد اللہ پر ہے۔ اسی سے التجا ہے کہ وہ خیر کی راہوں میں میری رہنمائی فرمائے۔

ایک مستقل مقدمہ میں میں ان باتوں کا ذکر کروں گا جو نصاریٰ کی گمراہی کا باعث ہوئیں اور جن پر ان کے موجودہ دین کی تمام عمارت قائم ہے[1]، مثلاً ابن اور اب کے الفاظ، روٹی اور شراب کا حضرت عیسیٰؑ کا گوشت اور خون بن جانا، یہ بات کہ وہ خداوند کے دہنے جانب بیٹھے ہیں، فرشتوں کی فوج میں اتریں گے اور قیامت کے دن عدالت کریں گے، یہ بات کہ وہ فارقلیط کو بھیجیں گے جو نصاریٰ کو تمام تفصیلات شریعت کی تعلیم دے گا، نیز یہ امر کہ ان کے زمانہ کے لوگ ان تمام باتوں کو دیکھیں گے جن سے انھوں نے ڈرایا ہے۔ ان تمام امور کی حقیقت الفاظ کے معانی کی تحقیق سے واضح ہو جائیگی جیسا کہ آگے مذکور ہو گا۔

---

[1] اس عنوان پر مولاناؒ نے الاکلیل فی شرح الانجیل کے نام سے مستقل رسالہ لکھنا چاہا تھا، لیکن اس کی تکمیل نہ فرما سکے۔

مقدمہ (۵)

قرآن قطعی الدلالت ہے

قرآن مجید بالکل قطعی الدلالت ہے۔ ہر آیت میں مختلف معانی کا احتمال محض ہمارے قلت علم و تدبر کا نتیجہ ہے۔ جن علماء نے اپنی تفسیروں میں بہت سے اقوال نقل کر دیئے ہیں ان کا منشاء یہ ہے کہ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو ہمارے سامنے رکھدیں۔ ان میں سے قول راجح کا انتخاب انھوں نے ہماری تمیز پر چھوڑا ہے۔ پس یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم بغیر کسی ترجیح و انتخاب کے تمام رطب و یابس یاد کر چھوڑیں۔ اور پھر حیرانی و سرگشتگی کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ مثال کے طور پر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں بقرہ کی آیت ۱۹۱ کے تحت لفظ فتنہ کے معنی دیکھو۔ انھوں نے اس کے پانچ معانی بتائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب صحیح نہیں ہیں۔ پس میں نے اپنی کتاب میں صرف وہی اقوال نقل کئے ہیں جو میری تحقیق پر صحیح اترے ہیں۔ اور یہی ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے۔ اقوال کی کثرت عموماً لوگوں کو بالکل حیران و درماندہ کر دیتی ہے۔ بسا اوقات لوگ مجرد اقوال نقل کر دیتے ہیں، ان کے دلائل بیان نہیں کرتے یہاں اقوال کے کہنے والوں اور ان کے سننے والوں

دونوں پر نہایت کھلا ہوا ظلم ہے۔ میں نے آیات کے معانی تفسیر کی کتابوں سے نہیں لیے ہیں بلکہ خود آیات پر ان کے سیاق و سباق اور ان کے مماثل آیات کی روشنی میں غور کیا ہے۔ اس طرح جب چند آیتوں کے معنی روشن ہو گئے ہیں تب میں نے تفسیر رازی یا تفسیر طبری اٹھائی ہے۔ ان میں کبھی تو ایسا ہوا کہ کوئی قول سلف کا میرے موافق مل گیا، کبھی میں سلف کے قول کے بالکل قریب قریب پہنچ گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ جو معنی میری سمجھ میں آئے تھے ان سے مجھے رجوع کرنا پڑا۔ اور ایسا بھی بارہا ہوا کہ کوئی مشکل ایسی پیش آگئی جس کے لیے مجھے عرصہ تک توقف کرنا پڑا۔ لیکن ہر حال میں اشکال و ابہام کو میں نے اپنے علم و فہم کی کوتاہی اور غلط رایوں کی عامیانہ تقلید ہی پر محمول کیا۔

اگر تم کو اس بات پر تعجب ہو کہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور واضح چیز میں ابہام و اشکال کا کیا ذکر، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کثافت پر تمہاری نظر نہیں ہے جس کی تہوں پہ تہیں ہمارے اوپر اڑھا دی گئی ہیں۔ کتنے کھلے ہوئے حقائق ہیں جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن جن طبیعتوں پر تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ ان کے دیدار سے محروم ہیں۔ وجود باری میں، اس کی وحدانیت و یکتائی میں، روح کی جسم پر حکومت میں، روزِ جزا میں، ایک صاحب بصیرت کے لیے کہاں شک کی گنجائش ہے؟ لیکن دیکھتے ہو کہ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو وجود باری اور توحید باری وغیرہ جیسے حقائق میں بھی شک کرتے ہیں، پھر دوسرے مسائل کا کیا ذکر۔ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ جس طرح حواس کو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اسی طرح عقل کو بھی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اور جب وہ بیماریاں اسکو لاحق ہوجاتی ہیں تو واضح سے واضح

حقیقت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ باتیں عقل و حواس کو تندرست فرض کر کے کہی جاتی ہیں تو جو عقل مبتلائے امراض ہو گی وہ ان کو کیسے سمجھ سکتی ہے؟ سورج روشن ہے اور ایک ہے، شکر میٹھی ہے اور سفید ہے، ایک سلیم الحواس انسان ان باتوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی شک نہیں کرے گا لیکن کیا ایک اندھے، ایک احول اور ایک تپ زدہ کا بھی یہی حال ہو گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ قبول، رشد و ہدایت میں سب کا حال یکساں نہیں ہو سکتا۔ قرآن شریف کی نسبت فرمایا ہے:۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ — یہ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ۝ — جب تم قرآن سناتے ہو ہم تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک کثیف پردہ ڈال دیتے ہیں۔

سقراط کا قول مشہور ہے کہ نفس کو تمام حقائق معلوم ہیں لیکن اس پر نسیان طاری ہے۔ مولانا رومؒ کا مقولہ ہے کہ اپنے نفس کی تاویل کرو، قرآن کی تاویل نہ کرو۔ خواجہ حافظؒ کا ارشاد ہے کہ سب سے بڑا حجاب تمہارا نفس ہے، اس کو دور کرو۔ ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟ بہرحال ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن نے ادائے مطلب کے لئے وہی اسلوب اختیار کئے ہیں جو سب سے واضح، سب سے زیادہ اقرب اور سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ اور

جہاں کہیں کسی اسلوب میں کوئی تصرف کیا ہے تو کسی اہم فائدہ کے لئے کیا ہے۔ ہم ایک علیحدہ مقدمہ میں اس پر بحث کریں گے اور وہاں تاویل کے وہ اصول بیان کریں گے جو مختلف اقوال کے احتمال کا سد باب کریں گے۔[۱] آیات متشابہات اور حروف مقطعات کے باب میں بھی ہمارا یہی مذہب ہے۔ وہ اپنی دلالت میں زیادہ سے زیادہ واضح ہیں۔ ہم ایک مستقل مقدمہ میں ان پر بھی گفتگو کریں گے۔

مقدمہ (۶)

مناسبت و ترتیب

جس طرح ایک سپہ سالار اپنی افواج کو مختلف ڈھنگ سے ترتیب دیتا ہے، اور اس کی تدبیروں اور مصلحتوں کو صرف ماہرین فن ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام صرف فتح و غلبہ ہی سے اسکی مہارت فن کا اندازہ کر سکتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہی جاتی ہے اور صرف ماہرین بلاغت ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان مختلف طریقوں میں الگ الگ کیا خوبیاں اور کیا بلاغتیں ہیں۔

ہمارے بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مقصد قرآن کے اعجاز کو ظاہر کرنا ہوتا ہے،

---

[۱] اصول تاویل پر مولانا مرحوم کا ایک مستقل رسالہ ہے، اب تک اس کے اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

لیکن میرے نزدیک اعجاز، قرآن کے اغراض و مقاصد میں سے نہیں ہے، بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ اس کائنات کے اندر ایک چھوٹے سے چھوٹے دانے بلکہ ایک حقیر سے حقیر ذرے سے لے کر اس گنبد گردوں تک جو کچھ ہے سب معجزہ ہی معجزہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی خلقت بھی اظہار اعجاز کے لئے نہیں ہوئی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے لئے ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے اُن کو بنانے سے عاجز ہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔

قرآن میں ایک ہی چیز کبھی عمود کی حیثیت سے آتی ہے، کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے۔ کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے، کبھی تفصیل کے ساتھ۔ کبھی ایک چیز مؤخر ہوتی ہے، کبھی مقدم۔ کبھی تنہا ہوتی ہے، کبھی اپنے مقابل کے ساتھ۔ کبھی کسی چیز کے ساتھ اس کا جوڑ ہوتا ہے، کبھی کسی چیز کے ساتھ۔ بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شے اپنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے جلوہ گر ہوگی تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچان لینے میں تمھیں دقت نہیں ہوگی۔ اگر ایک ادا سے نگاہ چوک گئی، دوسرا جلوہ سامنے آجائیگا۔

قرآن مجید کی اسی صفت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ۔	دیکھو کس طرح ہم پھیر پھیر کر اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔

اور ہر ترتیب میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے۔ ہم بالاجمال ترتیب کے

مختلف طریقوں کی طرف یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور اوپر جن پانچ امور کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے عمود پر غور کرو۔ عمود ہر سورہ کا ایک ہی ہوتا ہے لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ مثلاً سورہ حجرات کے عمود کو لو۔ ہے تو ایک ہی بات، گو لغت میں ہم اس کے لئے ایک ہی جامع لفظ نہ پا سکیں۔ تعبیر مطلب کے لئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بد خلقی پر ملامت اور جھڑکی ہے، عام اس سے کہ وہ بد خلقی خیال سے تعلق رکھتی ہو، یا قول سے، یا عمل سے۔ چنانچہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گفتگو میں سبقت، آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے، عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے، بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر لوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت، اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے، اُن کی عیب جوئی سے، تنابز بالالقاب سے، بدگمانی سے، تجسس سے، غیبت سے، غرور نسب سے، ادعائے پارسائی سے اور پھر سب سے آخر میں، سب سے بدترین شے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے۔

یہ ایک مثال میں نے اس لئے پیش کی ہے کہ تم وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھ سکو۔ اس کے حسنِ نظام پر مفصل بحث اپنے مقام پہ ملے گی۔

عمود کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سورہ کے اندر اپنی حقیقت کے اعتبار سے

سب سے عظیم الشان بات ہو۔ اس کے لئے عظیم الشان بات نہیں بلکہ سب سے زیادہ جامع بات
ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ سورہ کے تمام مطالب کے لئے شیرازہ کا کام دیتا ہے۔ ہاں بیان کے
لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے زیادہ اہم چیز ہوتی ہے۔ سورہ نور کے اندر، آیت نور کو دیکھئے وہ
کس طرح آفتاب تاباں بنکر چمک رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سورہ کے اندر عمود کی
حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک بالکل ضمنی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ عمود اس کا عورتوں
سے متعلق حسنِ ادب کی تعلیم ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ یہ سورہ عورتوں
کو پڑھائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو معلوم کر سکیں۔

یہ تو کسی چیز کے بطور عمود آنے کی شکل ہوئی۔ ضمناً آنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی
چیز بطور دلیل، یا بطور مثال آجائے، یا بعد میں آنیوالے دعویٰ کے لئے کسی مثال یا حجت سے تمہید
استوار کیجائے، یا ماسبق کی توسیع یا تحدید کیجائے یا کوئی سوال پیدا ہو رہا ہو اس کا جواب دیا جائے، یا ما
بعد کی تمہید ہو، یا کوئی مناسب مقام حکمت کی بات بر سبیل تذکرہ آجائے، یا ماسبق کی
تفصیل کی جائے، یا وعدہ و وعید اور مدح و ذم کے ذریعہ سے اس پر ابھارا جائے، یا کسی
مزید علم کا بیان ہو، یا موقع کی مناسبت سے حمد الٰہی اور صفات رب کا بیان ہو۔ اور
یہی آخری چیز قرآن حکیم کی روح ہے۔

اب ہم مختصراً اوپر کی باتوں میں سے پانچویں بات کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہتے
ہیں۔ یعنی اس بات کی کہ کس طرح ایک شے کبھی ایک چیز کے ساتھ ملائی جاتی ہے اور
کبھی دوسری شئے کے ساتھ۔ اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں

نہایت اعلیٰ حکمت مدنظر رکھی ہے تو جب تم ایک شے کو کسی شے کے ساتھ دیکھو گے ضرور ان دونوں کے درمیان مناسبت تلاش کرو گے۔ یہ تلاش ایسے مخفی دقائق حکمت تک تمہاری رہبری کرے گی جن دقائق تک وہ شخص کبھی نہیں پہنچ سکتا جو تدبر کا عادی نہیں۔ ایک ہی شے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، ایک پہلو سے وہ کسی چیز سے مناسبت رکھتی ہے اور دوسرے پہلو سے کسی چیز سے مثلاً دیکھو نماز اور حج میں کتنی مناسبتیں موجود ہیں دونوں ذکر الٰہی کی صورتیں ہیں، دونوں بدنی عبادتیں ہیں، دونوں بیت اللہ سے تعلق رکھتی ہیں، نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ طواف نماز ہے۔

نماز میں اتنی مناسبتیں تو حج کے ساتھ تھیں۔ اب روزہ کے ساتھ نماز کی مناسبتوں پر غور کرو۔ دونوں کسی مخصوص جگہ کی قید سے آزاد ہیں، دونوں کی بنیاد صبر پر ہے، یہاں تک کہ پہلے ادیان میں سکوت بھی روزہ کے شروط میں شامل تھا اس اعتبار سے گویا نماز نفس کا باطنی روزہ ہے۔

پھر نماز کی مناسبت زکوٰۃ کے ساتھ دیکھو۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں دونوں ایک دوسرے سے کمال کو پہنچتی ہیں۔ دونوں ایک ہی جڑ سے پھوٹی ہیں۔ نماز کی حقیقت بندہ کا خدا کی طرف محبت اور خشیت سے مائل ہونا ہے۔ اور زکوٰۃ کی حقیقت بندہ کا بندہ کی طرف محبت اور شفقت سے مائل ہونا ہے، پس کمال سعادت کے لئے دونوں لازمی ٹھہریں، اور ان دونوں کی روح محبت ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ خود دین کی حقیقت بھی محبت، گداز باطنی اور لطافت احساس ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ہی تمام صفات میں رحم کو مقدم کیا اور فرمایا کہ :-

وَسِعَتْ رَحْمَتِیْ کُلَّ شَیْءٍ — میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے۔

ظاہر ہے کہ دین کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس اس کے بندوں میں نظر آئے۔ اسی چیز کی وجہ سے انسان خدا کی خلافت کی عزت سے سرفراز ہوا ہے۔ پس نماز کی مناسبتوں پر غور کرنے سے ہم کو دین کی اصل اور تمام شرائع کی روح کا سراغ لگ گیا۔ یہی حقیقت تورات اور انجیل سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھو مقدمہ ۱۰)

ایک اور نہایت دقیق مثال لو۔ سورہ عقود (سورہ مائدہ) میں اللہ تعالیٰ نے پہلے کھانے کی چیزوں میں سے جو چیزیں جائز ہیں ان کو بیان کیا، پھر جن عورتوں سے نکاح جائز ہے ان کو بیان کیا، پھر وضو کا ذکر فرمایا۔ اب ان کی مناسبت پر غور کروگے تو دو چیزیں تمہارے سامنے آئیں گی۔ ایک شے اور ایک شرط تھے۔ شرائط میں سے وہ چیزیں بیان کیں جن سے یہ چیزیں پاک ہوتی ہیں۔ اب دیکھو ذبح چوپایوں کو پاک کرتا ہے، پھر اور نکاح سے عورتیں پاک ہوتی ہیں اور وضو نماز کی پاکی ہے۔ پھر اس تمام حقیقت کو آخر میں یہ فرما کر کھول دیا :-

مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکُمْ۔

اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے۔

یہ شرائط کا بیان تھا۔ اب اشیاء پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہاں تین چیزیں بیان کی

گئی ہیں طیبات طعام، طیبات نساء، اور نماز۔ اگر تعمق کی نگاہ سے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا چونکہ عالم کون و فساد ہے اس وجہ سے یہاں تین عالموں :۔ عالم شخص، عالم نوع اور عالم روح کے نقص کی تلافی تین چیزوں :۔ طعام، نکاح اور نماز سے فرمائی ہے۔

پھر طعام اور نکاح میں ایک اور مناسبت بھی ہے کہ دونوں میں سے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تخصیص کر دی گئی ہے، چنانچہ دیکھو دونوں آیتیں بالکل ایک ہی نہج پر وارد ہوئی ہیں

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ۔ الآیہ — تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں حرام ہیں۔

اور

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ (الآیہ) — تم پر مردار اور خون حرام ہے۔

اسی طرح نماز اور نکاح میں مناسبت کا ایک اور پہلو بھی ہے: نکاح بدکاری کی آلودگیوں سے حفاظت کرتا ہے اور نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ — بلاشبہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔

یہ مناسبت دونوں میں پاکیزگی کے پہلو سے تھی۔ اب سورہ بقرہ میں تخفیف کے پہلو سے ان کی مناسبت پر غور کرو۔ نماز کے متعلق فرمایا :۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ ۔۔۔ ۔۔۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا — نمازوں کی حفاظت کرو۔۔۔۔ پس اگر تمہیں اندیشہ ہو تو پیادہ

اَوْ رُكْبَاناً۔ یا سوار جس حال میں ہو نماز پڑھ لو۔

جس طرح نکاح کی حفاظت حتی الامکان واجب ہے مگر ضرورت کے وقت طلاق کی اجازت دے کر اس میں تخفیف کردی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح نماز کی حفاظت کی تاکید کے باوجود ضرورت کے وقت اس میں بھی تخفیف کردی گئی ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ ملائی جاتی ہے تو اس میں "قران نجوم" کے مانند گوناگوں مناسبتیں ہوتی ہیں۔ اور ہر ترتیب اپنے اندر ایک نیا جلوہ حسن و جمال رکھتی ہے۔

مقدمہ (۷)

ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے

اس مقدمہ میں ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے۔ اور سورتوں کے مطالب میں بے نظمی جو بظاہر نظر آتی ہے محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ ہر سورہ میں اگر کوئی ایک متعین مقصد نہ ہوتا، جس کے پورے ہونے تک سورہ پوری ہوتی ہو، تو یہ الگ الگ حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی، سارے قرآن کو ایک ہی سورہ بنا دیا جاتا؟ نیز جب سورتوں کے لئے کوئی خاص مقدار نہیں ٹھہرائی گئی، بڑی چھوٹی ہر طرح کی سورتیں

ہوئیں، تو اگر ہر سورہ کے اندر کوئی نظمی وحدت مدنظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی، اجزا یوں ہی بکھیر دیئے جاتے؟ اور اگر سطر سطر کے برابر کے اجزا ہوتے جب بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا؟

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا ایک مجموعہ ایک سورہ کے اندر رکھا گیا اور وہ سورہ کے نام سے موسوم ہوا۔ گویا ایک شہر بسا کر اس کے ارد گرد شہر پناہ کھینچ دی گئی۔ تو اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایک ہی شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی واضح ہے کہ معانی کا تشابہ بھی ان کو ایک شہر پناہ کے اندر نہیں جمع کرتا۔ معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) باہمدگر جس قدر مشابہت رکھتی ہیں معلوم ہے تاہم ان دونوں کو ایک سورہ نہیں قرار دیا گیا بلکہ دونوں دو مستقل سورتیں قرار پائیں۔ اسی طرح سورہ تکویر، انشقاق، مرسلات، نازعات، ذاریات سب ہم معنی سورتیں ہیں لیکن نظم اور اسلوب کلام ان میں مختلف ہیں۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جب قریش قرآن کے مانند دس سورتیں لانے سے عاجز رہے تو کم از کم ایک سورہ کے لئے مطالبہ ہوا۔ اس سے کم کے لئے مطالبہ نہیں ہوا اور سورتیں چھوٹی بڑی ہر قسم کی مراد ہوئیں لیکن اس سے ایک سورہ کے بقدر کلام مراد نہیں ہوا۔ ہمارے بعض مفسرین جو اس نکتہ سے واقف نہ تھے بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن نے اپنے مانند ایک سورہ کے بقدر کلام پیش کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے، ان کو کلام کی اتنی مقدار میں وجہ اعجاز تلاش کرنے میں زحمتیں پیش آئیں۔ مثلاً آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ الآیۃ سورہ کوثر سے مقدار

یں زیادہ ہے لیکن اس سوال میں ان کو حیرانی پیش آئی کہ اس میں اعجاز کا پہلو کیا ہے؟
اصل یہ ہے کہ قرآن نے جو مطالبہ کیا ہے اس میں پیش نظر ایک سورہ بحیثیت مجموعی ہے۔
بلاشبہہ کسی سورہ کی مثال پیش کرنا تمام جن و بشر کی طاقت سے باہر ہے اگرچہ سورہ کوثر کی سی مختصر سورہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ سورہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ایک منظم کلام ہے۔ اس میں چھوٹی اور بڑی کا امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح درخت، نبات اور حیوان کے الفاظ ہیں جو اپنے تحت کے تمام چھوٹے بڑے اجزاء پر مشتمل ہیں اسی طرح سورہ کا لفظ چھوٹی اور بڑی تمام سورتوں پر مشتمل ہے۔ بعض علماء کے اقوال سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ امام سیوطیؒ نے اتقان میں جعبری کا ایک قول نقل کیا ہے:۔

> "سورہ کی حد قرآن کی اتنی مقدار ہے جو چند آیات پر مشتمل ہو جن میں تمہید اور خاتمہ ہو اور اس کی کم سے کم مقدار تین آیت ہے"

اس محقق کے نزدیک سورہ کے لئے ایک ایسی نظمی وحدت ضروری ہے جس میں تمہید، خاتمہ اور عمود ہو اس لئے کم از کم تین آیتیں ایک سورہ کی تالیف کے لئے ضروری ہوئیں۔
مزید برآں اگر تم چھوٹی سورتوں پر تدبر کرو گے تو معلوم ہو گا کہ ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے وہ بھی بڑی سورتوں کی ہمسر ہیں۔ چھوٹی سورتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں جو بڑی سورتوں کے اندر ہیں۔ اس وجہ سے یہ خیال کرنا کہ چھوٹی سورتوں مثلاً سورۂ ماعون، سورہ کوثر اور سورہ عصر وغیرہ میں بے نظمی ہے

سخت غلطی ہے۔ ان سورتوں کا باریک نہج اگر تمھاری سمجھ میں آجائے تو بڑی سورتوں کا نہج سمجھنے میں اس سے تمھیں بڑی مدد ملے گی۔ اسی طرح بڑی سورتوں کے اندر آیتوں کے ایسے مجموعے ہیں جن کا نظم و ربط بالکل واضح ہے صرف ایک غبی آدمی ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتیں اپنے نظم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں پس جو شخص ان میں تفکر کرتا ہے اس میں آہستہ آہستہ ان سے زیادہ دقیق نظام سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کے تدبر میں میرا یہی حال ہوا۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ جستجو کی یہ راہ اختیار کریں گے وہ بالآخر نظم قرآن کو پالیں گے۔ وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی۔

(۸)
مقدمہ

احکام و حقائق کے باب میں قرآن اور کتب سابقہ کا تعلق

جس طرح سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد تاروں کی روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، اسی طرح قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد مسلمان بھی ان پچھلی آسمانی کتابوں سے بالکل بے نیاز ہو گئے جن میں جھوٹی اور سچی ہر قسم کی باتیں ملا دی گئی ہیں۔ تاہم

قرآن مجید آسمانی صحیفوں ہی میں سے ایک صحیفہ ہے اور ہمارے نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جماعت انبیاء ہی کے ایک فرد ہیں۔ اور تمام مسلمان آدم سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک، انبیاء کی کثرت کے باوجود ایک ہی امت ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لئے پچھلے صحیفوں کی تعلیمات کو جاننا ضروری ہے۔ اس سے ہم کو گوناگوں فوائد حاصل ہوں گے۔ اس سے دوسری کتابوں کے مقابل میں قرآن عظیم کی قدر و عظمت معلوم ہوگی اور ہم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پر اس کا شکر ادا کرنے کی توفیق پائیں گے۔ اس سے قرآن مجید کے وہ اشارات بھی واضح ہوں گے جو ہمارے دور آخر کے مفسرین سے مخفی رہ گئے اور اس کے سبب سے وہ ایک سے زیادہ مقامات میں اصل حقیقت تک نہ پہنچ سکے نیز اس سے اہل کتاب پر حجت قائم کرنے کے لئے دلائل ہاتھ آئیں گے جو بجائے خود ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔ (ہمارے اکثر مفسرین نے اپنی تصنیفات میں اس کے باوجود کہ اسرائیلیات کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اگلے صحیفوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک قلیل تعداد علامہ ابن تیمیہؒ جیسے بعض علماء کی آپ کو ملے گی جنھوں نے اہل کتاب پر خود ان کی کتابوں سے حق کو ظاہر کر کے ان کے خلاف حجتیں قائم کی ہیں۔ ان لوگوں کے یہ کارنامے بلاشبہ نہایت ہی قابل قدر ہیں، اور اس راہ میں میں بھی انہی لوگوں کے ساتھ ہوں۔)

قرآن مجید اگلے صحیفوں کے بعد درحقیقت دو مقصدوں سے نازل ہوا ہے

۱۔ دین کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس کی تکمیل کے لئے۔

۲۔ جن چیزوں میں اہل کتاب مختلف ہو گئے تھے۔ یا جن میں بھٹک گئے تھے یا جن کو

انھوں نے بھلا دیا تھا، یا جن میں انھوں نے زیادتی یا تبدیلی کر دی تھی، ان کی وضاحت کے لئے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی اس زیادتی اور تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا:۔

فَوَیْلٌ لِلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتَابَ	تو ان لوگوں کے لئے بلا کی ہے جو کتاب
بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ	اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے
هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا	ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ
بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔	اس کے ذریعہ سے کچھ معاوضہ
(البقرہ - ۷۹)	حاصل کر لیں۔

یہ وہ اصلی مقاصد ہیں جن کے لئے قرآن مجید نازل ہوا۔ باقی اس پر مزید ذکر الٰہی اور دعوت و موعظت کی وہ باتیں بھی ہیں جو تمام آسمانی کتابوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے قرآن مجید نے حکمت کی صرف اعلیٰ باتوں اور بلند حقائق ہی کو پیش نظر رکھا اور قصوں، تاریخی جزئیات اور جزوی احکام کی ان تفصیلات سے زیادہ تعرض نہیں کیا جن سے بالعموم قرآن کے مخاطب واقف تھے، کیونکہ واقفیت کے موجود ہوتے ہوئے ان کو دہرانا طبیعتوں پر بار اور بالکل بے نتیجہ ہوتا۔ چنانچہ قرآن نے جو قصے بیان کئے ہیں، نہایت بلاغت کے ساتھ یا تو بطور تلمیح اور مثال بیان کئے ہیں یا اہل کتاب کے کسی بڑے فریب کو واضح کرنے کے لئے بیان کئے ہیں۔ اسی طرح احکام و قوانین کے معاملہ میں صرف اسی حصہ سے تعرض کیا ہے جو تنقیح یا تکمیل کا محتاج تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے یا تو اہل کتاب میں سے تھے یا ان لوگوں

میں سے تھے جو اہل کتاب سے میل جول رکھ چکے تھے، اس وجہ سے پچھلی کتابوں کی باتوں سے واقف تھے، اور قرآن مجید کے اس اعجاز کے سبب سے ان کو اصل مسائل کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی تھی۔ بلکہ سابق صحیفوں اور قرآن مجید میں اصولی تعلیمات کے اتفاق کے باوجود جو فرق عظیم وہ پاتے اس سے ان کی نظروں میں قرآن کی عظمت بہت بڑھ جاتی۔ ان لوگوں کے اس تاثر کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ	جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول
إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ	پر اتری ہے تو ان کی آنکھوں میں
تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا	آنسو بھر آتے ہیں، بسبب اس حق
عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ	کے جس کو انھوں نے پہچان لیا۔
رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا	کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان
مَعَ الشَّاهِدِينَ۔	لائے۔ پس ہم کو گواہی دینے والوں
(مائدہ ۵ - ۸۳)	میں لکھ۔

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ پرانے صحیفوں کی غلطیوں کی تصحیح اور ان کی مشکل آیتوں کی تاویل قرآن کی روشنی میں کرنی چاہیئے۔ اہل کتاب کے لئے حق معلوم کرنے کی راہ یہی ہے۔

۲۔ قرآن اور کتب سابقہ کے مشترک قصوں میں جہاں اختلاف ہوگا وہاں ہم قرآن کی طرف رجوع کریں گے کیونکہ قرآن محفوظ ہے۔

۳۔ ابتدا سے لیکر تکمیل شریعت تک کے تمام مدارج کا جو شخص مطالعہ کرے گا اس پر اس ملت کاملہ کی فضیلت واضح ہوگی۔

۴۔ متضاد اور مخلوط اسرائیلیات کی حقیقت واضح ہوگی اور ہم میں سے جو لوگ ان کے سبب سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں ان کی غلطیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔

۵۔ اہل کتاب پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ قرآن ان کی کتابوں سے اخذ نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے برعکس ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ اور ان کو اوہام و خیالات کی وادی سے نکال کر حقیقت کی شاہراہ پر لاتا ہے۔

۶۔ قرآن کی ان بہت سی آیتوں کی صحیح تاویل ہو سکے گی جو درحقیقت توریت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں لیکن ہمارے مفسرین ان کو قرآن سے متعلق خیال کرتے ہیں مثلاً آیت مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا الآیۃ یا آیت فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ۔ الآیۃ

اس مقدمہ کو تمام کرنے سے پہلے ایک بات کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں جو عیسائی عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے پیش کرتے ہیں اور اس کو ہمارے خلاف سب سے زیادہ اپنی مضبوط دلیل سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ از روئے قرآن انجیل پر ایمان لانا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا اگر قرآن کسی امر میں انجیل کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنے آپ کو جھٹلاتا ہے اس کے بعد وہ ہم کو ان تمام لغویات و خرافات پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب میں ملا رکھی ہیں اور اپنے دعوے پر قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دلیل لاتے ہیں۔ مثلاً ۔ ۔ لہ

لہ اس مقام پر اصل میں بیاض ہے۔ غالباً مولانا یہاں قرآن مجید کی ان آیات کا حوالہ دینا چاہتے تھے جن پر

مقدمہ (۹)

سورتوں کی مقدار

اوپر یہ لکھ چکا ہوں کہ قرآن مجید کی چھوٹی سورتیں عظمت، مفہوم اور نظم کے اعتبار سے بڑی سورتوں کی ہمسری کرتی ہیں۔ اب اس اجمال کی تفصیل کرتا ہوں۔

ہمارے قدیم علمار نے بھی بعض چھوٹی سورتوں کی نسبت کہا ہے کہ "یہ تہائی قرآن کے برابر ہیں" یا بعض کی نسبت کہا ہے کہ "یہ پوری کرنے والی ہیں" مثلاً سفیان

(بقیہ حاشیہ صلا) چاہتے ہوں گے جن میں قرآن نے اپنی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ وہ پچھلے صحیفوں کی تصدیق کرنیوالا ہے اس میں شبہہ نہیں کہ اگر ان آیات کا وہی مطلب لیا جائے جو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں تو اہل کتاب کے لئے مسلمانوں پر اعتراض کرنیکی گنجائش نکلتی ہے لیکن قرآن مجید نے جہاں جہاں اپنے آپ کو پچھلے صحیفوں کی تصدیق کرنیوالا ظاہر کیا ہے اس سے اس کا مطلب یہ نہیں ہو کہ وہ ان تمام تحریفات کی بھی تصدیق کرنیوالا ہے جو توریت اور انجیل میں کی گئی ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان پیشین گوئیوں کو سچا ثابت کرنیوالا ہے جو توریت اور انجیل میں ایک آخری نبی کی بعثت سے متعلق وارد تھیں اور جن میں سے بعض تحریف کے باوجود اب بھی موجود ہیں۔ (مترجم)

ابن عینیہ سے روایت ہے کہ سورہ فاتحہ نماز کو پوری کرنے والی ہے کیونکہ یہ علم کو پورا کرنے والی ہے۔ حضرت امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ اگر صرف سورہ عصر ہی نازل ہوتی تو بھی کافی تھی۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں وہ کم از کم خاص خاص سورتوں کے بارہ میں تو اس حقیقت کے اعتراف سے انکار نہیں کر سکتے لیکن اگر قرآن کی تمام سورتوں پر اچھی طرح غور کیا جائے تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو سورتیں اپنے قامت کے اعتبار سے جتنی ہی چھوٹی ہیں معنی کے اعتبار سے اتنی ہی بڑی ہیں ان کے چھوٹے سے حجم کے اندر اسرار حکمت کے اتنے خزانے بند ہیں کہ اگر وہ کھول دیئے جائیں تو دفاتر کے اندر بھی نہ سمائیں۔

چھوٹی چھوٹی سورتوں کے اندر وسیع معانی بند کر دینے کا یہ اسلوب قرآن مجید نے مندرجہ ذیل وجوہ سے اختیار فرمایا۔

(۱) اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ دین کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اصول ہمیشہ ذہنوں کے سامنے مستحضر رہیں۔ یہ چیز چاہتی ہے کہ ان اصولوں کو نہایت مختصر کلمات اور بچے تلے الفاظ کے اندر گرہ کیا جائے کہ وہ امثال کی طرح زبانوں پر چڑھ جائیں تاکہ ذہن و دماغ کے لئے وہ جتنے ہی بھاری اور وزنی ہوں زبان کے لئے اتنے ہی ہلکے پھلکے ہوں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر طویل عبارتوں میں بیان کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ ان کے پھیلاؤ کے اندر گم ہو کے رہ جائیں۔

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ عموماً کسی تعلیم و دعوت کی ابتدا میں اس کے لئے لوگوں کے دل اچھی طرح نہیں کھلتے جس کے سبب سے نہ تو تفصیلات کلام کے لئے ان کے اندر گنجائش

ہوتی ہے نہ جزئیات احکام کے لئے۔ اس وجہ سے ابتداءمیں لوگوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ جوامع الکلم یعنی چھوٹے چھوٹے پر حکمت فقروں اور جملوں میں دی جاتی ہے۔ یہ جوامع الکلم کے بیج جب پھوٹتے ہیں تو تفصیلات سے ان کی آبیاری کی جاتی ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ دل کی وسعت اور اس کے علم دونوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

(۳) اہل عرب جس طرح مسجع اور مقفیٰ کلام کے بڑے دلدادہ تھے اسی طرح وہ کلام میں ایجاز و اختصار کو بھی بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس وجہ سے پہلے اسی اسلوب کلام میں ان کو دعوت دی گئی جس کو وہ پسند کرتے تھے تاکہ یہ کلام ان کو اپیل کر سکے۔

(۴) عرب کے کاہنوں کا کلام ایجاز و سجع دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اس طرز کلام کے اہل عرب بڑے گرویدہ تھے اور اس کو غیبی کلام کی ایک ضروری خصوصیت خیال کرتے تھے۔ یہ مناسبت بھی مقتضی ہوئی کہ قرآن مجید بھی یہی روش اختیار کرے تاکہ وہ اس سے بیگانگی نہ محسوس کریں۔

باقی رہا چھوٹی سورتوں کا بڑا ہونا تاویل کے پہلو سے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [1]

---

[1] یہاں مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے بیاض چھوڑ دی ہے اور ایک نہایت اہم بحث ناتمام رہ گئی ہے۔ لیکن قرآن کی چھوٹی سورتوں کی مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی جو تفسیریں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے تفسیر سورہ کوثر اس بات کے ثبوت کے لئے بالکل کافی ہے کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورہ بھی اپنے معانی کے لحاظ سے ایک بحر بیکراں ہے۔

(مترجم)

مقدمہ (۱۰)

قرآنی تعلیم کے اصولی مسائل

تعلیم قرآن کے بنیادی مسائل دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ عقائد اور اعمال۔

اعمال تین قسم کے ہیں۔ شخصی، منزلی، مدنی۔

عقائد کے بنیادی مسائل توحید، نبوت، معاد ہیں۔ (اپنے دلائل کے ساتھ)

اعمال میں نماز ہے اور اسی کے ساتھ حج بھی شامل ہے۔ زکوٰۃ ہے اور اسی کا جزء روزہ ہے۔ مکارم اخلاق ہیں (یعنی بر و معروف جس کا ضد منکر ہے) اور پھر شہادت بالحق ہے۔ یہ تمام شخصی اعمال ہیں اگرچہ ان کا تعلق جماعت سے بھی ہے۔ اس کے بعد عدل و قسط اور پھر اس کے بعد تعاون کا درجہ ہے۔

توحید کے ساتھ جبر و قدر اور وحدت الوجود کا تعلق ہے۔ پھر توحید اور نبوت کے ساتھ شفاعت کا تعلق ہے۔ معاد کے ساتھ جنت و دوزخ کی حقیقت کے مسائل ہیں۔

قسط میں میراث، نکاح اور معاملات داخل ہیں۔

تعاون میں خلافت، سیاست، اور جہاد شامل ہیں۔

پھر اعمال کے سرچشمے اخلاقیات میں بھی ہیں، مثلاً محبت، صبر، عزم، تقویٰ اور عدل ہیں۔

ان میں سے بعض چیزیں باعتبار اصول باہم گتھی ہوئی ہیں۔ میں نے کتاب اللہ سے جو کچھ سمجھا ہے اس کی روشنی میں بقدر ضرورت بعض مسائل پر گفتگو کروں گا۔

جہاد:۔ ہمارے قدیم مفسرین کا خیال یہ تھا کہ آیت سیف[1] نے موعظت و نصیحت اور کفار و مشرکین کے لئے رخصت و رعایت کی بہت سی آیتوں کو منسوخ کر دیا۔ ہمارے زمانہ کے متکلمین کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ آیت سیف نے منسوخ تو نہیں کیا ہے لیکن اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لئے ہے۔ ان کے خیال میں عہد نبوت میں جو غزوات ہوئے ان سب کی نوعیت دفاعی ہے۔ اور بعد میں خلفاء اور صحابہؓ نے جو لڑائیاں لڑیں وہ تمامتر ملوکانہ جنگیں تھیں۔ ان کو جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اصل حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وعدہ کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا جو حضرت ابراہیم

---

[1] آیت سیف سے مراد سورہ توبہ کی آیت فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ الآیہ (جب احترام کے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ان کے لئے ہر جگہ گھات میں بیٹھو الخ) ہے۔

علیہ السلام سے فرمایا تھا اور آپ کو اس ذمہ داری کا وارث بنایا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس آیت کے بموجب ڈالی گئی تھی۔

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ	یہ کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں،
وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔	اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ
(البقرہ - ۱۲۵)	کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

نیز آپ نبی خاتم کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے والا تھا۔ اس مقصد کے لئے پہلے آپ کو حکم ہوا کہ لوگوں کو وعظ و تلقین فرمائیں کہ لوگ آپ کی باتوں کو سنیں اور مانیں اور اپنے حالات کی اصلاح کریں۔ آپ کو قتال کی اجازت اس وقت تک نہیں دی گئی جب تک لوگوں پر اللہ کی حجت تمام نہیں ہوگئی اور تبلیغ کا فرض اچھی طرح ادا نہیں ہوگیا جب فرض تبلیغ اچھی طرح ادا ہو چکا تب آپ کو حکم ہوا کہ آپ خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرائیں اور عہد ابراہیمی کے بموجب دین حنیفی کو اس سرزمین میں ازسرنو تازہ کریں۔ اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس کے لئے قوت کو بھی استعمال کریں قوت کے استعمال کی یہ اجازت بھی آپ کو ہجرت کے بعد دی گئی۔ ہجرت کے بعد اس لئے کہ ہجرت سے پہلے جہاد سوائے اس کے جو حفاظت نفس کے لئے ہو، سراسر ظلم و فساد ہے[۱]۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتال محض دفاع کے لئے نہیں واجب ہوا بلکہ کعبہ کو فتح کرنے کے لئے اور بنی اسمٰعیل کے اندر دین

---

[۱] ہجرت سے پہلے قتال میں جو قباحتیں ہیں ان کی طرف مولانا نے اسی بحث کے آخر میں بعض مفید اشارات کئے ہیں۔ (مترجم)

حنیفی کو از سرِ نو قائم کرنے کے لئے ہوا۔

باقی رہے غیر بنی اسمٰعیل تو ان کے ساتھ جہاد کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ان کو عدل و قسط پہ قائم کیا جائے اور زمین کو فساد سے پاک کیا جائے۔ اہل کتاب اور غیر بنی اسمٰعیل کو دین کے معاملہ میں آزادی حاصل رہی۔ ان کے لئے ایمان نہ لانے کی صورت میں جزیہ کی راہ کھلی ہوئی تھی لیکن بنی اسمٰعیل کے لئے اتمام حجت کے بعد یہ راہ کھلی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ ان کے اوپر ان ہی کے اندر کے ایک شخص کے ذریعہ سے حجت تمام کردی گئی تھی۔ وہ اُن کا دل اور اُن کی زبان تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی باہر کے آدمی نہ تھے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر وعظ کہنے کے لئے بھیجدیا ہو۔ بلکہ آپ ان کے نخل فطرت کے ایک پختہ پھل تھے۔ آپ انہی کے اندر پیدا ہوئے انہی کی برائیوں اور بھلائیوں کے اندر آپ کی نشو ونما ہوئی لیکن آپ کی فطرت کی پاکیزگی نے ان کی تمام خوبیاں اپنے اندر جذب کرلیں اور ان کی ساری برائیاں پھینک دیں یہاں تک کہ آپ اس شفاف روغن کے مانند بن گئے جو آگ کے چھوئے بغیر بھڑک جانے کے لئے آمادہ ہو۔ آپ ان کی صلاحیتوں کے مرکز، ان کے ترک و اختیار کے لئے قوت تمیز اور ان کے ارادے کے لئے قلب کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کو ہدایت دیکر گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کے اندر آپ کی پوری امت کو اپنے آگے سرفگندہ کر دیا۔ کیونکہ آپ قلب کی منزلت میں تھے جب قلب نے اطاعت کرلی تو تمام اعضاء کے لئے یہی زیبا تھا کہ وہ بھی اطاعت کرلیتے۔ اس کی پوری تفصیل نبوت کی بحث میں ملے گی۔

پھر ظاہر اعتبار سے بھی صورت معاملہ اس کی مقتضی تھی کہ اہل عرب آپ کی دعوت سے

اعراض نہ کرتے۔ کیونکہ عرب کی سرداری قریش کو حاصل تھی اور قریش میں دینی پیشوائی کا منصب عبدالمطلب کو حاصل تھا، اور پھر عبدالمطلب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوا۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا۔

انا النبی لا کذب   انا ابن عبد المطلب

میں نبی ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے   میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں

نیز آپ ملت ابراہیمی کی طرف لوٹنے اور اس قدیم میثاق کی تجدید کی دعوت دے رہے تھے، جس کو اہل عرب تسلیم کر رہے تھے، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موقف پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ آپ جو کچھ کر رہے تھے بالکل ٹھیک تھا۔ باغی اور مفسد وہ لوگ تھے جو اس دعوت کی مخالفت کر رہے تھے۔

لیکن جہاد کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ رفع فساد کی خاطر جو لوگ جہاد کے لئے اٹھیں، ان کے لئے سب سے مقدم خود اپنے آپ کو شائبہ فساد سے پاک کرنا ہے۔ جب تک خلیفہ اور اس کے متبعین خود عدل پر قائم نہ ہوں اس وقت تک ان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عدل قائم کرنے کیلئے تلوار لیکر اٹھیں۔ پھر اپنے ملک کے اندر بغیر ہجرت کے جہاد جائز نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت اور ہجرت سے متعلق دوسری آیات سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد اگر صاحب جمعیت اور صاحب اقتدار امیر کی طرف سے نہ ہو تو وہ محض شورش اور بدامنی اور فتنہ وفساد ہے۔

پھر قتال کی اجازت حصول قوت کے بعد دی گئی ہے۔ حضرت شعیبؑ کی سرگزشت میں اس کی دلیل موجود ہے۔ انھوں نے فرمایا:۔

وَإِنْ كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا۔ (اعراف: ۸۷)	اگر ایک جماعت تم میں سے اس چیز پر ایمان لائی ہے جس کو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور دوسری جماعت ایمان نہیں لائی ہے تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان ٭

مذکورہ بالا تین شرطوں کے ساتھ جہاد قیامت تک کے لئے واجب ہے۔ دین کے معاملہ میں جبر اور شورش و بد امنی جائز نہیں ہے لیکن حق کی شہادت اور تبلیغ اور مجادلہ حسنہ ہمیشہ ضروری ہے۔

مقدمہ (۱۱)

معروف و منکر

معروف وہ ہے جس کو عرب نے معروف مانا ہو اور منکر وہ ہے جس کو انھوں نے منکر قرار دیا ہو۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں ایسے جنگلی نہیں تھے کہ خیر و شر میں ان کو کوئی

امتیاز ہی نہ ہو۔ یونانیوں اور ہندوستانیوں کے روشن ترین دور میں ان قوموں کے ادب کا جو حال تھا، اہل عرب کا ادب اخلاقی اعتبار سے اُن سے بھی بدرجہا اونچا تھا۔ جن لوگوں نے ان کی تاریخ بگاڑی ہے اگر ان کی مہملات سے قطع نظر کر کے تم ان کے کلام پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ان کا اخلاقی معیار کتنا بلند تھا۔ ان کے ہاں اخلاق کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امرء القیس باوجودیکہ ایک بادشاہ تھا لیکن چونکہ اسکی شاعری میں رندی و ہوسناکی کا پہلو نمایاں تھا اس وجہ سے وہ الملک الضلیل (آوارہ مزاج) بادشاہ کے لقب سے مشہور ہوگیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ایک ضمیمہ میں ان کے کلام سے کچھ نمونے پیش کریں، تاکہ واضح ہو سکے کہ ان کے ہاں وہی چیزیں معروف میں داخل تھیں جو مکارم اخلاق میں شمار ہوتی ہیں اور قرآن نے ان کے سامنے جو چیزیں پیش کیں وہ ان کے معروف کی تکمیل کرنے والی تھیں، نہ کہ اس کو ہدم کرنے والی۔ یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر جو صالح طبیعتیں تھیں ان کو قرآن نے بہت جلدی اپنی طرف جذب کر لیا۔ صرف ان لوگوں نے اس کی مخالفت کی جو شریر تھے یا جن کو اپنی مذہبی یا سیاسی پیشوائی کے چھن جانے کا اندیشہ تھا۔ ٹھیک اس طرح جس طرح علمائے یہود نے ضد اور حسد کی وجہ سے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی مخالفت کی۔ امیہ بن ابی الصلت وغیرہ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ یہ دین حنیفی کے معتقد تھے لیکن محض بربنائے حسد ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نبی کی روح بیدار خود بھی معروف و منکر کی تشناخت

کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارہ میں وحی کی رہنمائی موجود نہیں ہوتی ہے ان میں وہ اپنے الہام سے امت کو کوئی حکم اس وقت تک کے لئے دیتا ہے جب تک وحی نہ آجائے۔ اور یہ کام اس کے منصب کا ایک قدرتی جزء ہوتا ہے۔ نیز اس کو خدا کی طرف سے امر بالمعروف کا حکم ہوتا ہے اور امت کو یہ ہدایت ہے کہ وہ معروف میں سے جن باتوں کا حکم دے اُن میں اُس کی پیروی کرے۔ ان کے علاوہ آپ کے زمانہ میں پچھلی آسمانی شریعتوں کی بہت سی بچی کھچی باتیں، باقی رہ گئی تھیں۔ مثلاً دین حنیفی کی تعلیمات میں سے حج، قربانی، اور نماز کے کچھ بقایا موجود تھے، نیز اہل کتاب کے طریقے موجود تھے[۱]۔ آپ نے وقتی طور پر ان میں سے بھی بعض باتیں اختیار کیں اور وحی الٰہی کے آجانے کے بعد چھوڑ دیں۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں جزئیات احکام کا حکم نہیں ہوا بلکہ صرف معروف کا حکم ہوا مثلاً نماز، ذکر الٰہی، صدقہ، یتیم پر شفقت اور اس قسم کے دوسرے مکارم اخلاق۔ پھر جب کسی چیز کے بارہ میں تفصیل نازل ہو گئی تو اس میں اللہ کی تعلیم اصل بن گئی اور معروف کا لحاظ ختم ہو گیا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی امر کے بارہ میں معروف کا حکم ہوا۔ پھر اس کے متعلق توضیح نازل ہوئی تو جس حصہ سے متعلق توضیح نازل ہوئی اس میں تو معروف منسوخ ہو گیا اور جس بارہ میں توضیح نازل نہیں ہوئی اس میں معروف کا حکم بدستور باقی رہا۔ مثلاً

---

[۱] سر سید احمد کا یہ خیال غلط ہے کہ عربوں نے تمام مذہبی باتیں یہود سے اخذ کیں اور اسلام نے بھی اکثر احکام یہود ہی سے لئے اور دین حنیفی کے آثار میں سے صرف توحید، ڈاڑھی اور ختنہ باقی رہ گئے تھے۔ (فراہی)

مرنے والے کی وصیت والدین کے لئے منسوخ ہو گئی اور جن اقربا کو وراثت میں کوئی حق نہیں ملا ہے اُن کے لئے باقی رہ گئی۔

اصل یہ ہے کہ جن جزئیات تک انسان کی عام عقل اور فطری صلاحیت خود بخود پہنچ سکتی تھی، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر نہیں لادا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو تقویٰ اور نیکی کی جو صلاحیت خود ہمارے اندر موجود ہے وہ مردہ ہو جاتی۔ چنانچہ اس طرح کے معاملات میں اس نے ہماری عقل پر معروف کو چھوڑ دیا جیسا کہ بہت سی آیتوں میں دیکھتے ہو.....

اور یہ معروف کو باقی رکھ کر اور لوگوں کو اس کے اختیار کرنے کی دعوت دیکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک کے قانون اور اس کے اچھے رسوم کی عزت بڑھائی ہے۔ اور یہ اس امر کی صاف شہادت ہے کہ اسلام نے انقلاب اور تخریب کے بجائے اصلاح اور تکمیل کی راہ اختیار کی ہے۔ اس نے سابقہ ادیان کی بالاجمال تصدیق کی اور ان میں جو زیادتیاں شامل ہو گئی تھیں ان کو خارج کر کے لوگوں کو ان کی قدیم شاہراہ اور اس فطری ہدایت پر پہنچا دیا جو آدم کے وقت سے موجود تھی۔

مقدمہ (۱۲)

نظم کی دلالت

نظم کلام میں کچھ خاص حقیقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، جو اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں

جب ایک بات پر اس کے نظم کی روشنی میں غور کیا جائے۔ اگر نظم کا اہتمام ترک کر دیا جائے تو وہ باتیں لازماً نظر انداز ہو جاتی ہیں، جو خاص طور پر نظم ہی سے نکلتی ہیں اور نظم ہی کی رعایت سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے زکوٰۃ روک لینے والوں سے جو جہاد کیا اس کی دلیل ان کو نظم ہی کے اندر سے ملی۔ ان کے استدلال کی ترتیب گویا یوں تھی کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے وہ از روئے شریعت ہم سے الگ ہیں اور ہم کو ان سے قتال کا حکم ہے۔ تو جو لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ان کے لئے بھی یہی حکم ہونا چاہیئے کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر ہمیشہ نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ جب کتاب اللہ میں اس کی جگہ نماز کے بعد ہے تو لازماً یہی جگہ اس کی دین کے اندر بھی ہونی چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم نظم کلام سے بے پروائی برتیں تو کتاب اللہ کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اس دلیل میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ربوٰ کی حقیقت قرآن میں زکوٰۃ کی حقیقت کے خلاف قرار دی گئی ہے اور سود خواروں سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو لازماً یہی حکم مانعین زکوٰۃ کا بھی ہونا چاہیئے۔

مقدمہ (۱۳)

اجزائے نظام

تم اس بات سے ناواقف نہ ہوگے کہ قرآن مجید کی تقسیم رکوع اور تیس پاروں میں بعد کی چیز ہے۔ اور اگر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ رکوع کا مقصد فصل ہے۔ جن لوگوں نے رکوع ٹھہرائے ہیں انہوں نے مفاصل کلام کا لحاظ کرکے ان کی جگہیں متعین کردی ہیں۔ ان کے سامنے یہ چیز تھی کہ قاری ایسی جگہ قطع کلام نہ کردے جہاں وصل ہونا چاہیئے۔ اس مقصد کے لحاظ سے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں۔ لیکن ترتیب کے علم کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ کیونکہ رکوع کی تقسیم صرف فصل کا پتہ دیتی ہے۔ حالانکہ فصل کے ساتھ وصل بھی ہوتا ہے۔ رکوع کے ساتھ کلام یک قلم منقطع نہیں ہوجایا کرتا۔ رکوع سورہ کے تمام اجزاء کو ایک درجہ پر کردیتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات ایک بات دوسری بات کے تحت ہوتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کو حصوں، پھر ابواب، پھر فصلوں، پھر فقرات میں تقسیم کرتے ہیں۔ رکوع سے صرف فصل ظاہر ہوتا ہے۔ پس رکوعی تقسیم نے مفید ہونے کے باوجود نظم کے بیان کی ضرورت اور زیادہ بڑھادی ہے۔ تعیین رکوع سے پہلے کلام بالکل متصل

نظر آتا تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ جو غور کے عادی تھے وجوہ اتصال کا بھی پتہ لگا لیتے تھے لیکن رکوع ٹھہرا دینے کے بعد قاری کو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں بات بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اس لئے ایسی تقسیم کی ضرورت ہے، جو ربط و انقطاع اور وصل و فصل دونوں کو ظاہر کرے تیس پاروں کی تقسیم بالکل مقداری تقسیم ہے۔ اور بعض اوقات اس سے بھی قطع کلام کا گمان ہوتا ہے۔ میں اس کے ترک کو پسند کرتا ہوں۔ میرے خیال میں منازل کی تقسیم کافی ہے۔ یہ تقسیم سورتوں کے اجزا کی قطع و برید بھی نہیں کرتی۔

اوپر میں نے یہ جو کہا ہے کہ جن لوگوں نے سورتوں کو رکوعات میں تقسیم کیا ہے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اندازے ہر جگہ صحیح نہیں ہیں۔ انھوں نے بہت سے مفاصل چھوڑ دیئے ہیں۔ مثلاً سورہ قمر کو بلا لحاظ اسلوب کلام و مقدار تین رکوع میں تقسیم کر دیا گیا ہے حالانکہ اس کو چھ رکوع میں تقسیم کرنا تھا یعنی اس طرح :-

۱- اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ - ۲- كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ - ۳- كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ - ۴- كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ - ۵- كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ - ۶- وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ -

اس کام میں مدد خود قرآن مجید کے لفظی و معنوی اشارات سے مل سکتی ہے۔ لفظی اشارات کے لئے دلیل راہ سورتوں کے اوائل کے اسالیب ہیں مثلاً يَا أَيُّهَا الَّذِينَ - يَا أَيُّهَا النَّاسُ - أَلَمْ تَرَ - أَرَأَيْتَ - قُلْ وغیرہ اور واضح ہیں

رکوع نے اسی سے مدد لی بھی ہے۔ اسی طرح قافیہ کی تبدیلی، آیات کی مقدار، اسلوب کی یکسانی، عبارت کی ہمرنگی بھی ان کے سامنے رہی ہے . . . . [1]

مقدمہ (۱۴)

سُورتوں کے نام اور اُن کے عمود

سورتوں کے نام رکھنے میں چار اصول پیش نظر معلوم ہوتے ہیں :۔

۱۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی الفاظ سے رکھدیئے گئے ہیں سیوطیؒ کی تفصیل کے مطابق ایسی سورتیں مندرجہ ذیل ہیں :۔

الحمد، برأۃ، سبحٰن، طٰہٰ، حوامیم، یٰسین، اقتربت، الرحمٰن، تبارک، سأل، عم، والنازعات، أرأیت، سورہ تبت وغیرہ۔ یہود کے ہاں بھی اسی اصول پر صحیفوں کے نام رکھے گئے تھے۔

۲۔ بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ پر رکھدیئے گئے ہیں جو ان سورتوں میں استعمال ہوئے تھے اور نمایاں تھے مثلاً زخرف، شعراء، حدید، ماعون وغیرہ۔ یہ الفاظ سورہ کے مقصد کو نہیں ظاہر کرتے بلکہ سورہ کے اندر بطور ایک نمایاں نشان اور علامت کے

---

[1] یہاں اصل میں بیاض ہے۔ (مترجم)

ہیں جو اپنے مسمّیٰ کو ممتاز کرتے ہیں۔ اہل عرب اس اصول پر اشخاص اور اشیار کے نام رکھتے تھے۔ متلمس اور تابط شرا، وغیرہ ناموں میں یہی اصول ہے۔ اسی طرح منطقی، معانی کو کسی غرض خاص سے ممیز کرتے ہیں، اس کو حقیقت معنی سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔

۳۔ بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ سے ہیں جو سورت کے کسی اہم مضمون کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً سورہ نور کا نام آیت نور کی وجہ سے ہوا۔ آل عمران، سورہ نسار، سورہ ابراہیم، سورہ یونس وغیرہ بہت سے اسمار اسی طریق پر ہیں۔

۴۔ بعض سورتوں کے نام اُن کے اس مقصد کے لحاظ سے ہیں جو سورہ میں روح کی طرح جاری وساری ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کا نام سورہ صلوٰۃ ہے۔ اسی طرح سورہ برأت، برأۃ کے نام سے اور سورہ بنی اسرائیل، بنی اسرائیل کے نام سے اور سورہ محمد، سورۂ قتال کے نام سے موسوم ہوئیں۔ سورۂ اخلاص اور معوذتین بھی اسی ذیل میں شامل ہیں۔

یہ چوتھا اصول نام رکھنے میں سورہ کے اصل مقصد و مفہوم کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر ہر سورہ کا نام اسی اصول پر ہوتا تو اہل نظر کے لئے ہر سورہ کا نظام واضح ہو جاتا۔ میں اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا کہ سورتوں کے ایسے نام بھی رکھے جائیں جو ان کے مقصد کا پتہ دیں بشرطیکہ شریعت اس سے مانع نہ ہو۔ اب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ [۱]

---

[۱] یہاں اصل میں بیاض ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہاں سورتوں کے نام ان کے مضمون کے لحاظ سے رکھنے کے جواز پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ (مترجم)

(۱۵)

مقدمہ

تعیین خطاب

مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن میں تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، مثلاً اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے۔ علماء اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ تعلیم فرمائی ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ اس طرح کہو۔ لیکن یہاں "کہو" کا لفظ موجود نہیں ہے۔ تو اس مقدر کو کیسے جانا جائے؟

اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارہ میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ یعنی خطاب کن سے ہے؟ ہر خطاب میں دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کرنے والا کون ہے؟ دوسرا یہ کہ مخاطب کون ہے؟ اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ کبھی یہ عام ہوتے ہیں اور مراد ان سے خاص ہوتی ہے، اور کبھی اس کے بالکل برعکس۔ اور چونکہ جہت خطاب کی تبدیلی اور اس کے

عام یا خاص ہونے کی وجہ سے معانی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوجاتی ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے لئے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کرسکیں۔ کیونکہ اس معاملہ میں بعض مرتبہ ایسی غلطیاں ہوجاتی ہیں جو آدمی کو شائبہ شرک کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ مولانا رومؒ ایک جگہ یہ تک کہہ گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نبی کا بندہ بنا دیا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا الآیۃ (اے میرے بندو جنھوں نے زیاتی کی) کے الفاظ سے خطاب کریں۔ مولانا رومؒ کے متعلق میرا یہ گمان نہیں ہے کہ انھوں نے فی الحقیقت نبی کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے لیکن بات ان کی زبان سے ایسی نکل گئی ہے جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو معاف فرمائے۔ اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے۔ یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا الآیۃ کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے۔ اس کے شروع میں جو قُلْ ہے وہ پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہونچا دیں۔

کسی عام کلام کی توجیہ اس کی خاص جہت کے اعتبار سے ایک مستقل باب ہے اور اس کے اصول ہیں۔ تعیین خطاب کا علم بھی اسی باب کا ایک شعبہ ہے۔ جس شخص پر کلام کا صحیح رخ واضح نہیں ہوگا وہ اس کی صحیح تاویل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ پس یہ باب تاویل اور نظم کلام کے فہم کی کلید ہے اور اس سے بے خبری بہت سی غلطیوں اور ٹھوکروں کا سبب ہوسکتی ہے۔ ایک مستقل مقدمہ[1] میں ہم علم توجیہ کے عام قواعد بیان

---

[1] حاشیہ صفحہ ۔۔ پر دیکھیے۔

کریں گے۔ ان قواعد کے بیان کرنے سے پہلے یہ مقدمہ ہم نے محض اس لئے لکھ دیا ہے کہ فی الجملہ اس مسئلہ سے لوگوں کو اُنس ہو جائے۔ مسئلہ خطاب ان بہت سی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے جن میں ہمارے مفسرین مبتلا ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم اس پر علٰحدہ بحث کریں۔

خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اس کو لفظ مشترک کی طرح سمجھنا چاہیئے اور اس میں بعض پہلوؤں کا اختیار کرنا اور بعض کو چھوڑنا ناگزیر ہوگا۔ جس طرح ایک لفظ مشترک کے تمام معانی کو ہم معلوم کرتے ہیں اور پھر سیاق کلام کی روشنی میں کسی معنی کو اختیار کرتے ہیں اور کسی کو چھوڑتے ہیں، وہی طرز عمل ہمارا اس وقت ہوگا جب کوئی خطاب مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو۔ لہٰذا اولین قدم اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم خطاب کے مختلف پہلو معلوم کریں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہیٰ۔

مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا، یا جبریل، یا رسول، یا لوگ۔

اسی طرح منتہی یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا، یا رسول، یا لوگ۔

لوگوں میں مسلمان ہوں گے، یا منافقین، یا اہل کتاب، یا ذریت اسمٰعیل، یا ان میں سے دو یا تین یا سب۔

(حاشیہ ملٹ) اس مسئلہ کی پوری توضیح مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں اصول التاویل اور کتاب الاسالیب میں فرمائی ہے۔ یہاں یہ بحث ناتمام رہ گئی ہے مذکورہ دونوں کتابیں ابھی شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ (مترجم)

اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ یا دونوں۔

یہ پہلو تو بالکل ظاہر ہیں۔ اب ان کے اختلاط و التباس کی صورتوں پر غور کرنا چاہیے۔

مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ، رسول اور جبریل کے مابین ہوتا ہے۔ اگر تم بغیر تنبہ کے قرآن پڑھتے چلے جاؤ تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ قائل کون ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی تو بعینہ مرسل کا قول نقل کر دیتے ہیں اور کبھی وہ بات بطور خود ادا کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر جاری فرمائی ہے۔ پھر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض مبلغ کلام الٰہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپ کے معلم کی حیثیت سے، اور ان کے معلم ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہے۔ "عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ، ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ"

پھر یہ تمام حیثیات ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی بغیر کسی تنبیہ کے نمایاں ہوتی ہیں اور سیاق کلام کے سوا کوئی اور چیز اس باب میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی۔

اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انبیاء کے کلام کی یہ ایک مشترک خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ زبور میں بھی اس کی مثال موجود ہے۔ دیکھو ب ۴۶ : ۱ - ۷ - ۱۱ "لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے . . . . . خاموش ہو جاؤ اور جان لو کہ میں خدا ہوں . . . . . لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے"

قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ جب کلام صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا

تو اس میں جلال وہیبت اور قوت وسطوت کا اظہار ہوگا۔ لہذا اس طرح کا کلام ضرورت کے مواقع پر نمودار ہوتا ہے۔ ہم یہاں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مدعا سمجھنے میں تم کو آسانی ہو۔

مثلاً سورہ اقرأ شروع سے حضرت جبریل کی زبان سے ہے۔ لیکن جب غصّہ کے اظہار کا موقع آیا ہے تو کلام صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے ہوگیا ہے:۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا	یہ کچھ نہیں، اگر باز نہ آیا تو ہم چوٹی
بِالنَّاصِيَةِ	پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

ثنہی، میں التباس پیغمبرؐ اور مومنین کے درمیان ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ مخاطب بظاہر تو پیغمبر ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کا کان ہوتا ہے' اس لئے مخاطب اسی کو کیا جاتا ہے۔ تورات میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ مخاطب تو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو بصیغہ واحد کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد ان کی امت ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے مواقع میں نظم وسیاق کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کون ہے؟ سورہ توبہ میں ایک آیت ہے:

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ج	اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو
وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا	تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی مصیبت
قَدْ اَخَذْنَا اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ (۵۰)	پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے

یہاں خطاب واحد کا ہے لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں۔ چنانچہ اس کے جواب سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

قُلْ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا	کہہ دو نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی
كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا	مصیبت مگر جو اللہ نے ہمارے لئے
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا مولا ہے اور چاہیے
الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (توبہ: ۵۱)	کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان۔

اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہے لیکن خطاب امت کی طرف ہے مثلاً:۔

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ	اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک
اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا	یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ
تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا	ان کو اف کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور
وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۲۳)	ان سے ادب کی بات کہنا۔

اسی طرح کی متعدد مثالیں عام خطاب کی ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے:۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ	کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے ہے
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور
وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی کارساز
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۔ (۱۰۷)	اور مددگار نہیں ہے۔

اسی قاعدہ پر ہم آیت ذیل کو بھی محمول کرتے ہیں . . . . ۔ ۱

مقدمہ (۱۶)

کیفیت نزول

یہ بات خود قرآن مجید سے معلوم ہے کہ پورا قرآن بیک دفعہ نہیں نازل ہوا ہے۔

چنانچہ فرمایا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۔

(فرقان : ۳۲)

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر پورا قرآن بیک دفعہ کیوں نہیں اتار دیا گیا ہم نے اس کو اسی طرح اتارا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تمہارے دل کو مضبوط کریں۔ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ سنایا بڑا اہتمام کے ساتھ۔

اسی طرح پر قرآن موقع موقع کے لحاظ سے نازل ہوتا تھا۔ پھر جب کسی حکم کی تخفیف یا اس کی تکمیل کے لئے کوئی آیت نازل ہوتی تو آیا تو اس کو سابق حکم کے ساتھ رکھدیا

---

۱ یہاں بھی مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مسودہ میں خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور ایک نہایت اہم بحث ناتمام رہ گئی ہے۔ (مترجم)

جاتا یا پھر باب کے آخر میں تتمہ کے طور پر۔ لیکن چونکہ ابواب کے درمیان فصل صرف رکوع کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اس وجہ سے ان تتموں کی مناسبت معلوم کرنے میں لوگوں کو مشکل پیش آتی ہے۔ تاہم مندرجہ ذیل علامتوں سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ تتمہ ہے۔

یہ تتمے جہاں جہاں ہیں وہاں بالعموم اس بات کی تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ یہ کلام کسی سابق بات کی توضیح و تشریح کے طور پہ نازل ہوا ہے۔ سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا کہ جو باتیں مزید وضاحت کی محتاج ہوں گی ان کی بعد میں خدا کی طرف سے وضاحت کر دی جائے گی۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ چنانچہ اس وعدہ کے مطابق جب کوئی تشریح و توضیح نازل ہوئی تو اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کر دیا گیا کہ یہ توضیح ہے۔

علاوہ ازیں اس قسم کے تتمے جہاں جہاں ہیں ان کا اسلوب ماقبل اور ما بعد کے اسالیب سے عموماً مختلف ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تتمہ ہے۔

بعض مقامات میں ان کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یا تو کسی سوال مقدر کا جواب دیا گیا ہے یا کسی باریک بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

ان امور کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ بعض سورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئی ہیں، بعض حضرت جبریلؑ کی زبان سے اور اکثر براہ راست لسانِ الٰہی سے۔ یہی انداز قدیم صحیفوں میں بھی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی پوری

حیثیت سے مختلف باتیں کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ گمان کرلے کہ یہ ساری باتیں ایک ہی شخص کی زبان سے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے کلام کا ربط سمجھنا ناممکن ہو جائے گا۔

یہ بات ہم نے محض بطور مثال ایک صورت حال سمجھانے کے لئے کہی ہے ورنہ کلام الٰہی ان مثالوں سے بہت ارفع ہے۔

مصنفؒ کی دوسری کتابوں کے اردو ترجمے

ذبیح کون ہے؟ :- یہ کتاب استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں اہل کتاب کے دعوی کے خلاف قرآن مجید اور تورات کے نہایت محکم دلائل سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

اقسام القرآن :- یہ کتاب استاذ امام کی بے مثال تصنیف "امعان فی اقسام القرآن" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی قسموں کے متعلق تمام اصولی مباحث کی تفصیل کی گئی ہے۔ اور اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو اس طرح بے نقاب کیا گیا ہے کہ اس نے اس باب میں بالکل حرف آخر کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے اگرچہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن اپنے معارف کے لحاظ سے صدہا کتابوں پر بھاری ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ قیمت صرف ایک روپیہ ۱۲ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- دائرہ حمیدیہ ، مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر، ضلع اعظم گڈھ